راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

Monthly
Arzang
Lahore

ماہنامہ

ارژنگ
لاہور

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

جنوری ۲۰۲۶ء

CamScanner

کالم نگار کے لیے غیر جانب داری ممکن نہیں ہے

عہد ساز صحافی، ڈرامہ نویس اور شاعر

منّو بھائی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرنے والا ہر لکھاری ترقی پسند ہے: منو بھائی

بیادِ مُنّو بھائی

انیس جنوری منو بھائی کی برسی کا دن ہے۔ وزیر آباد میں پیدا ہونے والا عہد ساز صحافی، رجحان ساز ڈرامہ نویس، خوش نوا شاعر اور ترقی پسند مصنف ایک بامقصد اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار کر 8 سال پہلے اسی روز دیارِ عدم روانہ ہوئے۔ منو بھائی سے جب کوئی ان کا سن پیدائش پوچھتا تو مذاقاً ہٹلر کے جرمنی میں

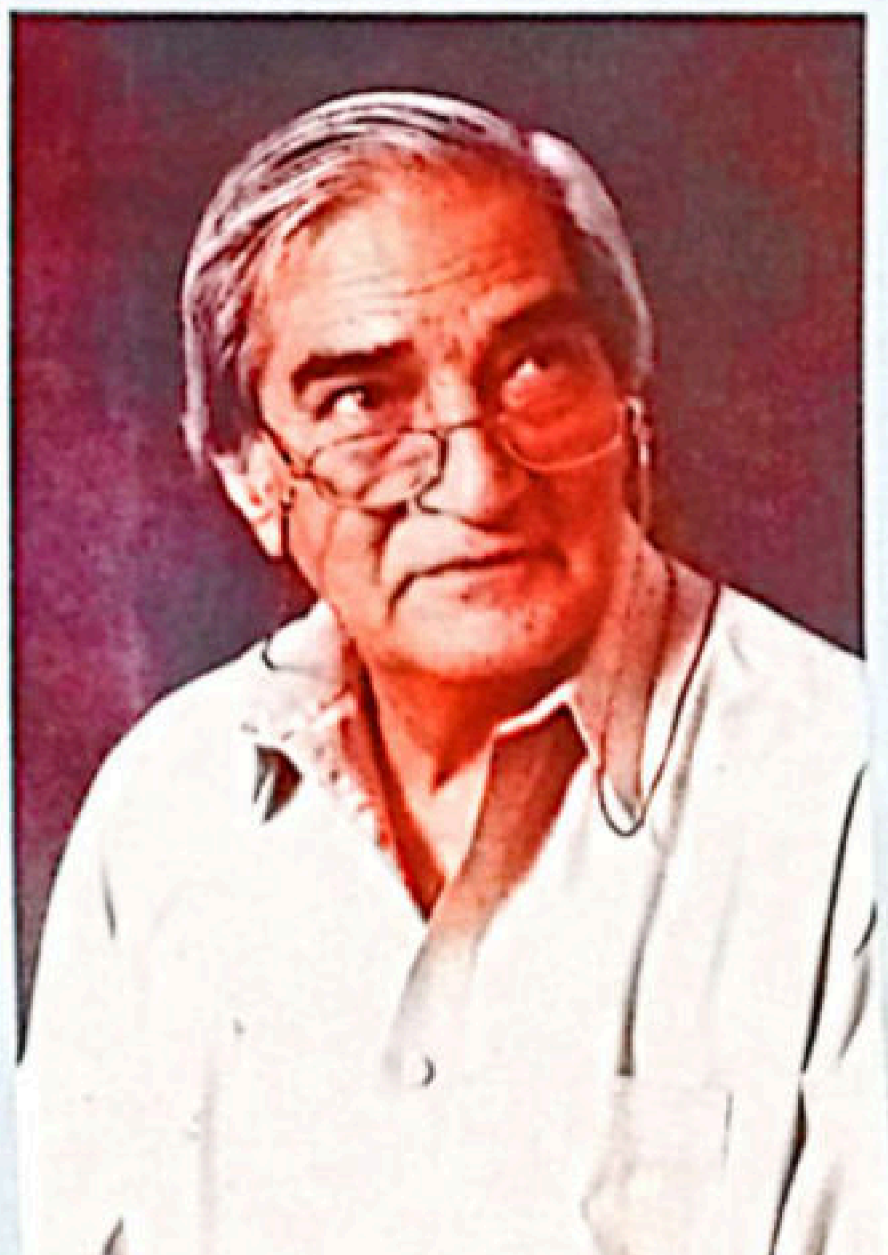

برسرِ اقتدار آنے کے واقعے کو ساتھ ملا کر 1933ء بتایا کرتے تھے۔ جس منیر احمد قریشی کا نام احمد ندیم قاسمی نے منو بھائی رکھا تھا، وہ چھ دہائیاں صحافت میں بھرپور طریقے سے سرگرم عمل رہے مگر ان کے بدترین مخالف بھی ان کی دیانت کی گواہی دیتے تھے۔ نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی کہنے پر مجبور تھے کہ اس شخص نے کبھی اپنے نظریات کی قیمت وصول نہیں کی، قلم کی خدمت کو پامال ہونے نہیں دیا۔ تمام زندگی انہوں نے اپنے قلم کو غریبوں کے حقوق اور کمزوروں کی حمایت کے لیے استعمال کیا۔ بے کسوں، مسکینوں اور لاچار و نادار لوگوں سے ان کی خصوصی محبت تھی۔ تمام زندگی اس مجبور و محکوم طبقے کے لیے وہ قلمی جہاد کرتے رہے۔ میری خوش قسمتی کہ میرا ان کی صحبت میں کافی وقت گزرا۔ ان کے ساتھ عقیدت مندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے شروع ہوگیا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں ایک دن میں نے اور ابرار ندیم نے منو بھائی کے گھر ان کی بیگم کی موجودگی میں ان کا انٹرویو کیا جو کہ ماہنامہ ارژنگ میں شائع ہوا۔ ان کی برسی کی نسبت سے ان کا انٹرویو دوبارہ شائع کرنے کا مقصد خراجِ تحسین پیش کرنا ہے اور قارئین کو یاد دہانی کرانا کہ ایسے بلند کردار بھی اہلِ قلم گزرے ہیں۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

CS CamScanner

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

جنوری 2026ء جلد 27 شمارہ 1

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

نعت ' 2 تا 3

مضامین:
- کلامِ جمیل / جسٹس (ر) میاں نذیر اختر ' 4
- بیوروکریسی اور ہمارے حکمران ' / الطاف حسن قریشی ' 8
- تبسم چمنستان ادب پر ایک خوشبودار نظر / نسیم سحر ' 9
- مقبولِ عام ادیبوں کا المیہ / ناصر عباس نیر ' 11
- ذات سے کائنات تک / قیصر نجفی ' 13
- ادبی گروہ بندیاں اور معاصرانہ چشمک / ظہیر گیلانی ' 15
- ماں میں آیا تھا / ڈاکٹر تصور اسلم بھٹہ ' 17
- سائنس اور شاعری کی خوبصورت ملاقات / عرفان جاوید ' 24
- قیامت کے شاعر کی باتیں / عارف انیس ' 26
- ہندکو رحل-عبدالوحید بسمل / 28

طنز و مزاح:
- مزاحمتی مرغے / قراۃ العین حیدر ' 31

افسانے:
- پہچان / بلقیس ریاض ' 33
- خاموش لمحے / لبنیٰ صفدر ' 36
- چوراہے کی عورت / ساجدہ امیر ' 38

کالم:
- پھر کیا ہوگا؟ / عامر بن علی ' 40

انٹرویو:
- بقیہ انٹرویو: منو بھائی ' 41
- بقیہ انٹرویو: احمد ندیم رفیع ' 42

سفرنامہ:
- خزاں کے رنگ / عامر بن علی ' 45
- یورپ کے آئینے میں خودکلامی / حسن عباسی ' 46
- ادبی تقریبات ' 48
- تبصرہ کتاب ' 52

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد

وہ پھول جو وجدان کے صحرا میں کھلا ہے
اس پھول کی خوشبو کے تعاقب میں ہوا ہے
کہیے کہ قریبِ رگِ جاں ہے وہی جاناں
وہ شوخ ہے ایسا جسے دیکھا نہ سنا ہے
کلیوں کا تبسم بھی تو مسکان ہے اس کی
دیکھا تو وہی پھول کے پردے میں چھپا ہے
ادراک کی لہروں میں رواں ہے وہ ازل سے
وہ خون میں شامل ہے مگر پھر بھی جدا ہے
پہنچا ہے سرِ عرش تصور کا پرندہ!
یہ قوتِ پرواز بھی خالق کی عطا ہے
یہ سوچ کے رکھا ہے قلم ہاتھ سے میں نے
کیا حمد ہو اس کی جو دو عالم کا خدا ہے
کھل جائے حسن کا یہ عقیدہ بھی جہاں پر
بندوں سے محبت مرے خالق کی رضا ہے

حسن عسکری کاظمی/لاہور

وہ بصیرت وہ رہنمائی دے
ہر حقیقت مجھے دکھائی دے
میرے لفظوں سے خوشبوئیں پھوٹیں
میری سوچوں کو پارسائی دے
تیری حمد و ثنا میں عمر کٹے
بس یہی طرزِ خوشنوائی دے
روح کو رکھ حصار میں اپنے
دل کو آفات سے رہائی دے
عجز میرا کمال تک پہنچے
اپنے محبوب کی گدائی دے
مجھ کو رکھ کنجِ بے نشاں میں مدام
کب کہا ذوقِ خودنمائی دے
سلطنت درد کی عطا کر کے
منزلِ شوق تک رسائی دے

علی رضا/ساہیوال

نعت

لبوں پر ثبت جس دم مہرِ استبداد ہوتی ہے
مرے سینے میں برپا محفلِ میلاد ہوتی ہے
میں جب چاہوں، طوافِ روضۂ اقدس میں کھو جاؤں
عبادت وقت کی ہر قید سے آزاد ہوتی ہے
کہاں کی آگہی، کیسی خرد مندی، پئے طیبہ
جنوں آثار ہوتے ہیں، وفا بنیاد ہوتی ہے
درِ حیرت پہ پتھرائے ہوئے ہر ایک چہرے پر
مرا افسانہ ہوتا ہے، مری روداد ہوتی ہے
ہزاروں محفلیں قربان اُس تنہائی پر کر دوں
وہ تنہائی جو انؐ کے ذکر سے آباد ہوتی ہے
میں اُن لمحوں کے بدلے عمرِ نوحؑ و خضرؑ کیا لیتا
وہ لمحے جب، کرم فرما نبیؐ کی یاد ہوتی ہے
حضورؐ! اب تو بلا ہی لیجیے مجھ کو حضوری میں
غمِ فرقت اُٹھانے کی بھی استعداد ہوتی ہے
مسلسل اب بھی ہوتے ہیں عطا اشعار نعتوں کے
مسلسل اب بھی اُس گھر سے مری امداد ہوتی ہے
رگ و پے میں ہزاروں بجلیاں کوندیں نہ کیوں سیفی
یہ وہ در ہے، جہاں سے روشنی ایجاد ہوتی ہے

منیر سیفی

میں اُمتی ہوں اُنؐ کا میں ہوں غلام اُنؐ کا
میرے لبوں پہ دائم رہتا ہے نام اُنؐ کا
دن ہو کہ رات انؐ پر بھیجوں درود ہر دم
میں حرزِ جاں بناؤں سچا پیام انؐ کا

بس نامِ مصطفیٰؐ ہی وردِ زباں ہو دائم
پھر رحمتوں بھرا ہی ہر سو سماں ہو دائم
گر ذکرِ مصطفیٰؐ کی ہم محفلیں سجائیں
انوار ہم پہ برسیں دن کا گماں ہو دائم

خالق نے خود بنایا رحمت تمام انؐ کو
مالک نے خود ہی بخشا اعلیٰ مقام انؐ کو
مالک صلوٰۃ بھیجے ان پر ملائکہ بھی
بھیجو درود تم بھی بھیجو سلام انؐ کو

توفیق دی خدا نے توصیفِ مصطفیٰؐ کی
اچھی لگے مجھے تو بس نعت مصطفیٰؐ کی
میری نہیں ہے تنہا یہ ہے روش خدا کی
قرآں میں دیکھ لو تم نعتیں ہیں مصطفیٰؐ کی

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

خاتم المرسلینؐ، رونقِ دو جہاں
اور کوئی نہیں، رونقِ دو جہاں
دے رہے ہیں گواہی یہ جبریل بھی
ہیں حرا کے مکیں رونقِ دو جہاں
فیصلہ آسماں کا یہی تھا، کہ ہو
وہؐ چٹائی نشیں رونقِ دو جہاں
اِس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ ہیں
آپؐ ہی بالیقیں رونقِ دو جہاں

میرے آقاؐ، وہی خاتم المرسلیں
میری دنیا و دیں رونقِ دو جہاں
وردِ صلِّ علیٰ میرے ہونٹوں پہ ہے
کہہ رہی ہے جبیں، رونقِ دو جہاں
جس چٹائی پہ تشریف فرما تھے آپؐ
وہ ہوئی شہ نشیں، رونقِ دو جہاں
آپؐ ہیں، دے رہے ہیں گواہی تسیم
آسماں اور زمیں، رونقِ دو جہاں

نسیم سحر/[illegible]

نبی ﷺ کی پاک سیرت سے تعلق جس نے جوڑا ہے
پھر اس کو رب کی رحمت نے بہت کچھ دے کے چھوڑا ہے
خدا نے خود ہے فرمایا: درود ان پر پڑھیں مومن
اگر چہ رات دن پڑھ لیں وہ لگتا پھر بھی تھوڑا ہے
وہ رحمت کل جہانوں کی، جسے چاہیں بدل ڈالیں
عمرؓ کی سخت گیری کا بھی رُخ آقاؐ نے موڑا ہے
جہاں معصوم بچیوں کو بھی زندہ دفن کرتے تھے
وہاں باطل کی سب رسموں کو آقاؐ نے ہی توڑا ہے
تھے کافر آزمانے پر، دکھائیں چاند کو لا کر
نبی ﷺ کے ایک اشارے نے دو ٹکڑے کر کے جوڑا ہے
محمد ﷺ کی غلامی میں ہے شاہوں سا سکوں بسملؔ
بلائیں جب وہ در اپنے تو پھر مشکل بچھوڑا ہے

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

شمع توحید کی سرکار جلانے آئے
یعنی ظلمات کا ہر نقش مٹانے آئے
میں نے ہونا تھا محمدؐ کا سو میں ہو بھی چکا
ایسے بے کار میں دنیا مجھے پانے آئے
جب بھی دھتکار کے دنیا مجھے تنہا کر دے
آپؐ کی یاد مجھے دل سے لگانے آئے

نعت کہنا تھی ''کہا'' صلی علیٰ سیدنا
لفظ یک دم لیے نعتوں کے خزانے آئے
آپؐ ہی تو شبِ یلدا کے قفس سے آخر
صبح بے تاب کو آزاد کرانے آئے
کون سی خلق ہے طیبہ جو نہ آتی ہوگی
ہر کوئی دل کی یہاں پیاس بجھانے آئے
کاش سو جاؤں انھیں یاد میں کرتے زاہدؔ
اور طیبہ کی ہوا مجھ کو جگانے آئے

زاہد محمود زاہد/ملتان

آنکھوں کی جان قلب کا محبوب ہو گیا
سردارِ انبیاء سے جو منسوب ہو گیا
دیکھا سبھی نے اس کی حکومت کو پاش پاش
جس کو گراں حضورؐ کا مکتوب ہو گیا
جس نے بھی کی نبیؐ کے لیے اپنی سوچ پست
وہ شخص دو جہان میں معتوب ہو گیا
ان ظالموں سے ہم کو بچائے رکھے خدا
جن ظالموں سے اک نبی مصلوب ہو گیا
پڑھتے ہیں اپنے آقاؐ پہ ہر گام ہم درود
بس اپنی زیست کا یہی اسلوب ہو گیا
اصحابؓ کی نبی پہ نچھاور رہی حیات
ان کا عمل خدا کو بھی مرغوب ہو گیا
مجھ سا گناہ گار شفاعت کی بارشیں
یہ سوچ کر دل آپ ہی مجوب ہو گیا
سمجھا اسے رضائے خدا اور نبیؐ عدیلؔ
جو کچھ ہوا مرے لیے وہ خوب ہو گیا

ابراہیم عدیل

درِ حضورؐ پہ طرزِ تپاک دیدنی ہے
ہر امتی کا یہاں انہماک دیدنی ہے
کسی بھی ملک سے آئے ہوں تشنۂ دیدار
وفورِ شوق کا یاں اشتراک دیدنی ہے
بنے ہیں ذہن جہاں اور دل ہوئے تعمیر
ہے جس کا نام مدینہ وہ چاک دیدنی ہے
انہیں کے نور سے ذرے ہیں آفتاب صفت
انہیں کے فیض سے یہ مشتِ خاک دیدنی ہے
مرے حضورؐ نے کاٹے ہیں روز و شب جس پر
وہ خاک دیدنی ہے ارضِ پاک دیدنی ہے

ڈاکٹر بدر منیر/خوشاب

اس سمت ہی جاتا ہے مدینے کا مسافر
فردوس کماتا ہے مدینے کا مسافر
سب سے بڑا اعزاز مدینے کا سفر ہے
قدر اپنی بڑھاتا ہے مدینے کا مسافر
لپٹے ہوئے احرام کی سج دھج کوئی دیکھے
کس شان سے جاتا ہے مدینے کا مسافر
جب تک کہ وہ رہتا ہے مدینے میں تو ہر روز
اک عید مناتا ہے مدینے کا مسافر
آ جاتا ہے اک نور سا آنکھوں میں اُتر کر
جب بھی نظر آتا ہے مدینے کا مسافر
چُن لیتی ہیں راہیں بھی عقیدت سے وہ موتی
جب اشک بہاتا ہے مدینے کا مسافر
پھر مجھ کو ندیمؔ اور نظر کچھ نہیں آتا
جب سامنے آتا ہے مدینے کا مسافر

ریاض ندیم نیازی/سبی

کلامِ جمیل

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/ لاہور

فوج سے تعلق رکھنے والے کئی شعرا اور ادیب بہت مشہور و معروف ہیں جن میں کیپٹن (ر) بہزاد لکھنوی (۱۸۷۳ء تا ۱۹۴۸ء)، میجر (ر) محمد حسین آزاد (۱۸۳۹ء سے ۱۹۱۰ء)، کرنل (ر) سیّد ضمیر جعفری (۱۹۱۶ء تا ۱۹۹۹ء)، کرنل (ر) محمد خان (۱۹۱۰ء تا ۱۹۹۹ء)، کرنل (ر) سیّد مقبول حسین (۱۹۴۲ء تا ۲۰۲۲ء) ، کرنل (ر) اشفاق حسین (۱۹۸۰ء، پیدائش)، لیفٹیننٹ کرنل مبارک علی صدیقی، وغیرہم شامل ہیں۔ عسکری شعبوں سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حوالے سے پروفیسر شاکر کنڈان نے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں دو سو سے زائد شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جدید دور کے ایک شاعر لیفٹیننٹ کرنل (ر) میاں محمد جمیل اطہر کی پہلی کتاب چشمِ فلک میرے مطالعہ میں آئی۔ میں نے اسے بصد شوق اوّل تا آخر پڑھا۔ بہت چشم کشا اور دِل کشا کلام ہے۔ ہر شعر میں صداقت، محبت اور حقیقت کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگا کہ شاعر کہہ رہا ہے:۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں سوچ، فکر اور ظاہری پیکر کے اعتبار سے سارا کلام واقعی کلامِ جمیل ہے۔ یوں شاعر نے اپنے نام جمیل کی خوب لاج رکھی ہے۔ میری دلی دعا ہے: اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

شاعر نے ہر مضمون پر طبع آزمائی کی ہے۔ ڈینگی مچھر سے لے کر شہدائے وطن تک، ذاتی غموں سے لے کر ملی و قومی غموں تک، دنیا کے معاملات سے لے کر دینی معاملات اور فکرِ عقبیٰ تک ، بہت سے موضوعات پر اپنی فکر اور سوچ کے رنگ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔ یوں چشمِ فلک شاعری کے آسمان پر قوسِ قزح کے سے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ موضوعات کے تنوّع کے جلو میں فکر کی پختگی، ایمان کی قوّت، شعور کی نزاکت اور اظہار کی قدرت ہر نظم و غزل میں جلوہ گر ہے ۔ شاعر کا شعبہِ حیات شعر و شاعری نہیں، بلکہ سپہ گری یا عسکری زندگی ہے لیکن اس نے شعر و شاعری کی رزم گاہ میں بھی فتوحات کے علَم گاڑے ہیں جو اس کے ادبی ذوق کے گواہ ہیں ۔طنز و مزاح کا شعبہ ابتذال یا پھکڑ پن کا قریبی ہمسایہ سمجھا جاتا ہے لیکن شاعر اس کوچے سے بھی تبسّم کناں، آبرومندانہ طریق سے گزر گیا ہے ۔اس کی طنز اور مزاح بھی با مقصد اور مثبت ہے جس سے قاری کو شگفتگی اور تبسّم کے ساتھ ساتھ خیر و خوبی اور اصلاح کے پیغامات ملتے ہیں۔ یوں مزاحیہ کلام بھی باطنی سنجیدگی اور مقصدیّت کا حامل ہے۔

غزل میں ایک موزوں مطلع کہہ لینا کامیابی کی کلید سمجھا جاتا ہے لیکن جمیل اطہر کی شاعری میں مطلعے مارچ کرتے چلے جاتے ہیں اور جب ہالٹ ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کلام کا بھی اختتام ہو گیا ہے۔ یہ اندازِ حسنِ آمد کا مظہر ہے اور پتہ دیتا ہے کہ شاعر قادر الکلام ہے اور اس کے دل و دماغ میں جذبات کا ایک سمندر موجزن ہے جو اپنی باطنی قوّت سے چھلک چھلک جاتا ہے۔

حمد و نعت کا ابتدائی مختصر سا حصّہ بہت خوب ہے۔ اس میں اللہ کریم کی عظمت کا بیان اور رسولِ کریم ﷺ سے محبت کا اظہار والہانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اللہ کریم کی حاکمیّت اور عظمت ،اُس پر ایمان و ایقان، اس کے حکموں پہ تسلیم و رضا اور رسولِ کریم ۸ سے محبت کی جھلک حمد و نعت کے اشعار میں ملتی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

تو حاکمِ اعلیٰ ہے سدا ارض و سما میں
ہر دور کا سلطان ترے در کا گدا ہے
تو اپنے کرم سے ہی گنہگار کو بخشے
اطہؔر کا بھی سر کب سے ترے در پہ جھکا ہے

تیرے در سے جو لَو لگا لی ہے
اپنی بگڑی ہوئی بنا لی ہے
تیرے در پر سکوں ملا دل کو
کھو گئی تھی جو چیز پا لی ہے

نعتیہ کلام میں توصیفِ نبی ﷺ بڑی عقیدت و محبت سے کی گئی ہے۔ آپ ﷺ کی نسبت سے درست اِسلامی عقائد کا اظہار بھی بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار قابلِ غور ہیں:۔

لے کے میں بارِ عصیاں، آیا ہوں در پہ تیرے
نادم خطاؤں پر ہوں، اب مجھ کو تو بچا لے
گناہ گار کو تب خدا بخش دے گا
درِ مصطفیٰ ﷺ سے دعا جس نے پا لی

ان اشعار میں اِس آیہ مبارکہ کی روح سموئی ہوئی ہے جس میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا (سورۃ النساء : آیت ،)۔

ترجمہ: اور اگر وہ کبھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو وہ آپ کے پاس حاضری دیں ،اللہ سے معافی چاہیں اور رسول بھی ان کے لیے طلبِ مغفرت کریں

CS CamScanner

تو ضرور وہ اللہ کو توبہ کرنے والا اور رحم کرنے والا پائیں گے۔

چند نعتیہ اشعار میں عقیدۂ ختم نبوت کا اظہار بڑے سادہ مگر پختہ انداز میں کیا گیا ہے۔ جیسے:۔

ملکِ عرب میں آخر ماہِ تمام آیا
ربِ کریم کا وہ لے کر پیام آیا
ہر ایک لب پہ آخر حق کا پیام آیا
خاتم یہ انبیا کا جگ کا امام آیا

یعنی سب انبیا کے بعد آخر کامل و اکمل ترین ہستی حضرت محمد ﷺ کی بعثت ملکِ عرب میں ہوئی۔ آپ ﷺ اپنی عظمت، شان، اوصاف اور اخلاقِ حسنہ کے اعتبار سے ماہِ تمام یعنی بدرِ کامل ہیں۔ یہ اشعار اس گمراہ کن عقیدے کا بطلان کرتے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خطبہ الہامیہ (صفحات ۰تا) میں بیان کیا ہے۔ اُس نے حضور نبی اکرم ﷺ کے دور کو اُن کی روحانیت کی ترقی کا پہلا قدم قرار دیا اور اسے ہلال یعنی پہلی رات کے چاند سے تشبیہ دی۔ اس نے اپنے وجود کو حضور ﷺ کا ہی وجود قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ اس کی صورت میں حضرت محمد ﷺ کی بعثتِ ثانیہ ہوئی ہے تا کہ اشاعتِ دین کی تکمیل کی جائے۔ اُس نے مزید دعویٰ کیا کہ بعثتِ ثانیہ میں حضور ﷺ کی روحانیت (مرزا کی صورت میں) اقویٰ، اکمل اور اشد ہے جو بدر یعنی چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے (استغفر اللہ)۔ ایک اور جگہ پر شاعر نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کا اظہار یوں کیا:۔

پُر نور ہیں فضائیں، آتی ہیں یہ صدائیں
آئے جہاں میں لوگو، ختم الرسل ہمارے
حضور ﷺ آپ ﷺ ہی خاتم الانبیا ہیں
رسولوں میں ہے آپ ﷺ کی ذات عالی
کرے اب جو کوئی نبوّت کا دعویٰ
جگہ اُس نے جھوٹوں میں اپنی بنا لی

حضور نبی کریم ﷺ کا فرمانِ عالی ہے کہ میرے بعد (مختلف ادوار میں) تمیں کذاب ظاہر ہونگے۔ ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے لیکن جان لو کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں (نیا نبی)۔ (راوی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ۔ ترمذی شریف: حدیث نمبر۔ باب۔ جلد دوم۔ فرید بک سٹال اردو بازار لاہور۔ ابوداؤد شریف جلد دوم۔ ص

جدید غزل اپنے قدیم روایتی پیکر میں زندہ ہے۔ مگر اب یہ محض عشقِ مجازی کی داستان، محبوب کے لب و رخسار اور قد و قامت کا گوشوارہ، یا گُل و بلبل کا فسانہ نہیں بلکہ اپنے اندر بہت نئے مضامین اور مفاہیم سموئے ہوئے ہے۔ اب غزل میں غمِ حبیب کے ساتھ ساتھ غمِ حیات، غمِ معاش، غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ اور دیگر کئی غموں کے رنگ جھلکتے ہیں۔ معاشرے کے مصائب و آلام، سیاسی مسائل اور حکام کے مظالم کا تذکرہ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں، فلسفہ اور دین و مذہب کے پیغامات، اعلیٰ انسانی اقدار اور انسانیت سے محبت کا درس بھی ملتا ہے۔ یوں جدید غزل ایک وسیع چمنستانِ فکر و خیال بن گئی ہے۔ یہی حال جمیل اطہر کی غزل کا ہے۔ ویسے اس کی غزلوں میں مجازی محبوب سے کہیں زیادہ اللہ اور اس کے حبیب A کا ذکر ملتا ہے۔ محبوب کا ذکر وہ کانی بچ بچا کر کرتا ہے۔ اس حوالے سے ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

عشق کی آگ میں رہے زندہ
دل کی دنیا عجیب ہوتی ہے
چین دل کا جو چھین لیتی ہے
وہی صورت طبیب ہوتی ہے

نہ منصب نہ دنیا نہ زر چاہتا ہوں
میں اُلفت بھری اِک نظر چاہتا ہوں

بُھولی یادو لوٹ نہ آنا
پھر سے ہم کو نہ تڑپانا
دل پہ کیا کچھ بیتی اطہر
غیروں کو نہ راز بتانا

بیٹھ جاتا ہوں، رات کو اُٹھ کر
جیسے تو نے مجھے پکارا ہے
تیری صورت بسائی آنکھوں میں
عرش سے چاند یوں اُتارا ہے

آئے نہ کوئی حرف کبھی تیرے نام پر
تیرے حسین شہر سے اب جا رہا ہوں میں

اِس دل سے تیری یاد بھلائی نہیں جاتی
یہ شمع فروزاں ہے بجھائی نہیں جاتی
چہرے سے تو کچھ حال محبت کا عیاں ہے
ہاں دِل میں لگی آگ دکھائی نہیں جاتی

زندہ ہوئے ہم مر کے فقط تم پہ جہاں میں
اب غیر پہ مر کے بھی کبھی ہم نہ مریں گے
اُلفت کی نگاہوں سے کسی غیر کو دیکھیں
یہ ظلم تو تا زیست کبھی ہم نہ کریں گے

دنیا کو داغ دل کا دِکھایا نہ جائے گا
قِصہ کسی کو غم کا سنایا نہ جائے گا
دل کے ورق پہ نقش ہوا کس کا نام ہے
یہ راز بھی کسی کو بتایا نہ جائے گا

اِن اشعار سے ایک نیک سیرت، صالح، گریز پا عاشقِ وفادار کا چہرہ سامنے آتا ہے جو دنیا کو بتا رہا ہے کہ تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی یا تو میرے دل کی آخری آواز۔ اس نے اپنی چاہت کو نہاں خانہ دل میں مخفی رکھنے کی کوشش کی ہے تا کہ یہ راز داستانِ بزم نہ بن

CS CamScanner

جائے۔اس کا مسلک یہ نظر آتا ہے:

اُلفت ہے راز، راز کی حد تک ہے سرفراز
جب داستانِ بزم بنی خوار ہو گئی

شاعری کا ایک المیہ یہ ہے کہ فکر کی بلندیوں پر محوِ پرواز رہنے والے کبھی کبھی کرگسیّت کا شکار ہو کر عالمِ بالا سے پستی پر اُتر آتے ہیں۔ وہ جزیرہ ابتذال میں قیام فرما ہو کر کچھ اٹھکیلیاں اور خوش فعلیاں فرماتے ہیں۔ پھر صعود فرما کر فلک پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔ قاری حیران ہو کر سوچتا ہے ایسی بلندی ایسی پستی اس کرگسیت کی زد میں کئی مشہور و معروف شعرا بھی آئے جنہوں نے بطور شاعر اپنی عظمت، بلند مرتبے اور فنی مہارت کے باوجود محض کوچہ ابتذال میں آوارہ گردی کے باعث اپنے ہی روشن ناموں کو گہنا دیا۔ ان میں اکبرالٰہ آبادیؔ، نظیراکبرآبادی، میر تقی میرؔ اور جوش ملیح آبادیؔ جیسے بڑے شعرا بھی شامل ہیں۔ لاریب وہ شعر و ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہیں سوقیانہ اشعار کہنے اور پست خیالی پر اُترنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ان کے غلط فکری زاویے ادب برائے ادب نے انہیں عریاں نگاری کے میدان میں دھکیل دیا۔ میر تقی میرؔ کے دیوان میں تقریباً دو سو قابلِ اعتراض اشعار ملتے ہیں۔ موصوف نے ایسے اشعار نہ صرف جنسِ مخالف بلکہ ہم جنسوں کے عشق و محبت کے بارے میں بھی کہے ہیں۔ میرؔ، کا مکمل دیوان پڑھنے کے بعد دل میں خیال آیا کہ کاش میں یہ سارا دیوان نہ پڑھتا تو میرے دل میں میرؔ کا وہ مقام قائم رہتا جس کے وہ اپنے دیگر اعلیٰ کلام کے باعث مستحق ہیں۔ عریاں نگاری کی یہ علّت فارسی شعرا اور قدیم دور کے دبستانِ لکھنو میں بھی پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدی عظیم روحانی اور ادبی مقام کے حامل ہیں لیکن ان کی کتاب گلستان کا پانچواں باب بعنوان در عشق و جوانی محلِ نظر اور ان کے دیگر افکار و اشعار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے یہ مدارس میں پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعد میں کسی فارسی دان شاعر نے یہ باب لکھ کر شیخ سعدی سے منسوب کر دیا ہو؟ جدید دور کے آزاد خیال شعرا کا کیا ذکر کرنا، وہ تو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادب برائے ادب کا تمغہ عریاں نگاری حاصل کرنے کے مشتاق نظر آتے ہیں۔ میری کُتب چھاپنے والے لاہور کے مشہور ادارے نستعلیق کے مالک (مدیر، ماہنامہ رسالہ ارژنگ لاہور) حسن عباسیؔ نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ ملک کے ایک مشہور اور ثقہ شاعر نے انہیں غزلیات پر اپنی کتاب چھاپنے کے لیے دی۔ انہوں نے مطالعہ کر کے یہ کہہ کر کتاب چھاپنے سے انکار کر دیا کہ اس میں کثیر تعداد میں فحش اشعار ہیں۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد شاعر موصوف اپنی کتاب سے فحش اشعار نکالنے پر رضا مند ہو گئے۔ چنانچہ عباسی صاحب نے قابلِ اعتراض اشعار نکال کر ان کی کتاب شائع کی۔

الحمدللہ! جمیل اطہر کی شاعری کا دامن اوپر بیان کردہ آلودگی سے پاک ہے، اُس کی غزل و نظم کے اشعار میں ایک صاحبِ ایمان، قناعت پسند، محبِّ وطن، خوددار اور درد دل رکھنے والے انسان کی صورت نظر آتی ہے جو دفاعِ دین و وطن اور ناموسِ رسالت کے لیے اپنا تن مَن دَھن وار دینے کے جذبوں سے سرشار ہے۔ اُس کی فکری جولان گاہ میں اللہ اور اس کے رسول A سے محبت، حُسنِ فطرت سے محبت، اپنے آباء و اجداد، والدین شریفین اور بیوی بچوں سے محبت، اپنی خاندانی اور فوجی زندگی سے محبت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محبت شامل ہے۔ وہ راہِ محبت کا سچا راہی ہے، کوچہ ابتذال کا جز وقتی باسی بھی نہیں۔ غزلیات میں کئی اشعار، نُدرتِ خیال اور حُسنِ اظہار کے باعث چونکا دینے والے ہیں۔ جیسے:

آئے نظر تو رب کا بھی جلوہ دکھائی دے
نہ آئے تو وجود نہ اپنا دکھائی دے
اوجِ فلک سے دیکھو تو اپنی زمین بھی
صحرا میں جس طرح کوئی ذرّہ دکھائی دے

اسی بحر میں ایک دوسری غزل کے یہ اشعار پڑھیے:

مِل جائے چشمِ بینا تو کیا کیا دکھائی دے
قرآں کا نور ہم کو جھلکتا دکھائی دے
اسرار اپنے منہ سے سدا بولنے لگیں
بوڑھے میں ایک طفل مچلتا دکھائی دے
نورِ خودی بھی سرِ نہاں ہے حیات کا
جو ضربِ لا الٰہ سے کُھلتا دکھائی دے

چشمِ فلک کی نظمیں، غزلوں پر سبقت لے جاتی نظر آتی ہیں۔ فوجی زندگی کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں حقیقی واقعات، فوجی تربیت کی مشقّتوں اور عملی زندگی کی سختیوں کو بطریقِ احسن بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں، فوجی احباب کے لیے بالخصوص اور ایک عام قاری کے لیے بالعموم بہت دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے باوجود شاعر میں جہاد اور سرفروشی کے جذبات زندہ و تابندہ ہیں:

ہم افسر گو ریٹائرڈ ہیں، پر قائم ابھی جوانی ہے
منہ پھیریں گے ہر دشمن کا جب ہم نے گن اُٹھانی ہے

تربیت کے دوران اساتذہ اور سینیئرز کے بے رحم ہاتھوں سے ملنے والی سختیوں اور ناروا سلوک کا تذکرہ نظم PMA کا کول کی یاد میں ملتا ہے۔ سینیئرز کے خلاف سُلگتے ہوئے جذبات کا اظہار اس شعر میں

CS CamScanner

کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کر دیا ہے:۔

ثانی نہیں ہمارا ویسے تو فائرنگ میں
لیکن بنا سکے نہ کوئی سینٹر نشانہ

یہ اظہارِ تاسف مزاحیہ رنگ کا غماز ہے۔اس لیے یہ شعر قابلِ گرفت نہیں۔عسکریات کے حصہ میں شامل سب نظمیں، لائقِ مطالعہ ہیں، نظم کا کی وردی والے کے یہ اشعار خصوصی توجہ کے قابل ہیں:۔

جلوہ فرنگ کا ہے دھوکے کا ایک جال
پھیلاؤ چار سُو یہ اقبال کا پیام
کشتی وطن کی ہر دم پھر ڈولنے لگی ہے
دُشمن کی حرکتیں ہیں کچھ رہبروں کے کام
محتاط رہنا اطہر عیّار دشمنوں سے
رکھیں چُھری بغل میں، منہ پہ ہے رام رام!

حصہ نظم میں شامل ساری نظمیں خوب ہیں، بالخصوص مدینہ طیبہ، اسلام، حجرِ اسود، ماں، بیگم، پیغام، غمِ گوناگوں، استاد، حافظ اور یوم تکبیر بہت خوب ہیں۔

اپنے والدین شریفین، مرحوم بھائی میاں سمیع ارشد، دیگر بزرگوں اور عزیزوں کے وصال کے حوالے سے کہی گئی نظموں میں اُن کے اخلاق و کردار کی خوبصورت تصاویر پیش کی گئی ہیں۔کنوارے بابے ایک دلچسپ مزاحیہ نظم ہے لیکن اس کا یہ پیغام بھی سنجیدہ ہے:

نکاح کر کے کرنا نباہ زندگی بھر
طریقِ شرافت ہے اِک خاندانی
گنواؤ نہ یوں عمر گھر کو بسا لو
انہوں نے نصیحت کسی کی نہ مانی

حویلی نامہ کے یہ اشعار لائقِ توجہ ہیں:۔

روڑے نہ اینٹ پتھر، کیا تھی بھلا حویلی؟
سیکھا جہاں پہ ہم نے اخلاق کو بنانا
در اصل تھی حویلی تہذیب دین و مذہب
اِک مرکزِ ہدایت، آبا کا آستانہ
اِک ارضِ باکرامت اِک مظہرِ شرافت
اِک اولیا کا مرکز اِک رحمتِ ربانہ

حویلی کا حقیقی مقام بتانے کے بعد شاعر نے اپنے آبا سے حاصل کردہ اسباق کو یوں بیان کیا:۔

آبا نے ہم کو دائم، اسباق یہ پڑھائے
اپنا وجود ہم نے ہے آگ سے بچانا
دنیا کی عیش و عشرت اِک عارضی نشہ ہے
حرص و ہوس سے اپنا دامن سدا بچانا
اسلام نے شریعت دنیا کو جو عطا کی
سختی سے اُس پہ چلنا چاہے ہنسے زمانہ

حویلی نامہ پڑھتے ہوئے ماضی کی یادوں کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں اور دل میں بے ساختہ یہ آرزو کروٹیں لینے لگتی ہے کہ کاش حویلی کی زندگی پھر لوٹ آئے۔اس کا اظہار اِن اشعار میں ملتا ہے:

سپنوں میں بس رہی ہے رنگین سی حویلی
پھر بن کے اک حقیقت لوٹ آئے وہ زمانہ
آؤ بنائیں مِل کے پھر دلکشا حویلی
پاکیزہ زندگی ہو پُرنور ہو گھرانہ

شاعر کا کلام، ادب برائے ادب کے برعکس، ادب برائے زندگی کے مسلک کا مظہر ہے۔یہ محض دانشوری کا مظاہرہ کرنے، حدود و قیود سے آزاد حُسن وعشق کے جلوے دکھانے یا تفریحِ طبع کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ مقصدیت کا حامل ہے۔اسلام کی عظمت اور تعلیمات کی پیروی، اخلاقی اقدار، شرافت اور پاکیزگی کی ترویج، جذبہِ جہاد کو قائم رکھنا اور دفاعِ وطن شاعر کے مقاصدِ جلیلہ ہیں۔حالیؔ، اقبالؔ اور حفیظؔ جالندھری کی شاعری بھی مقصدیت کی حامل ہے۔ان عظیم شعرا نے ادب برائے زندگی کی راہ ملّت کو دکھائی۔جو شاعر بھی اِن عظیم ہستیوں کے نقوشِ قدم پر چلا، وہ اُن کا تلمیذ بلکہ مریدِ باصفا بن گیا اور جمیل اطہر کی طرح اپنے کلام میں جرات و بے باکی سے ادب برائے زندگی کا علم لہراتا رہا۔

ماہنامہ الحمرا لاہور
بہ یادِ حضرت مولانا حامد علی خاں

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔
لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔
ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت
شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم، محفلِ احباب، خصوصی گوشے، ہر شمارہ ایک نیا زاویہ، ایک نئی خوشبو
اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ماہنامہ ''الحمرا'' میں آپ کا پُرخلوص خیر مقدم ہے!
اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں
J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور، 0333-4001844

بیوروکریسی اور ہمارے حکمران

الطاف حسن قریشی/لاہور

آزادی ہند ایکٹ 1947ء کی رو سے پاکستان 14 اگست 1947ء کی نصف شب معرضِ وجود میں آیا۔ اگلی صبح پاکستان کے گورنر جنرل قائدِاعظم محمد علی جناح نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو پاکستان کا وزیرِاعظم تعینات کیا اور بعدازاں چودھری محمد علی کو پاکستان کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا جو انڈین سول سروس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور عبوری حکومت میں وہ مسلم گروپ کے مشیر تھے۔ تقسیم کے وقت حالات سخت دگرگوں تھے۔ دونوں طرف آگ اور خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ سے زائد مسلمان شہید کیے جا چکے تھے اور ساٹھ لاکھ سے زائد مسلمان پاکستان ہجرت کر چکے تھے جبکہ خستہ حال نئے ملک میں اُن کا بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ اُس وقت پاکستان کا کوئی دارالحکومت تھا نہ کوئی انتظامی نظم و نسق موجود تھا۔ زیادہ تر غیر مسلم بیوروکریٹس بھارت چلے گئے تھے اور پاکستان میں سرکاری دفاتر خالی پڑے تھے۔ ایسے میں چودھری محمد علی نے بڑی محنت سے بیوروکریسی کا ڈھانچہ قائم کیا۔ قائدِاعظم کی اپیل پر ہندوستان کے ترقی یافتہ صوبوں میں کام کرنے والے مسلم اہلکار بڑی تعداد میں پاکستان آئے اور اُنہوں نے مقامی بیوروکریسی کے تعاون سے بیوروکریسی کا ایک عمدہ ڈھانچہ کھڑا کیا اور شہریوں کی شب و روز کی اَن تھک محنت اور فرض شناسی نے پاکستان کو معاشی طور پر اِس قدر مضبوط بنا دیا کہ بھارت کا روپیہ پاکستانی روپے کے مقابلے میں بہت کمزور پڑ گیا۔ اِس پر بھارت نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اپنا روپیہ فوری طور پر ڈی ویلیو کرو، ورنہ ہم فوجی ایکشن لیں گے۔ اِس پر قائدِ ملّت لیاقت علی خاں نے کراچی میں وزیرِاعظم ہاؤس کی بالکونی سے مکا لہراتے ہوئے کہا کہ ہم اُسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیں گے۔ تب دشمن اپنی فوجیں سرحدوں سے دور لے گیا۔ اِس طرح عالمی سطح پر پاکستان کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی، لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے حکمران طبقات اور بیوروکریسی میں تعلقات کشیدہ ہوتے چلے گئے جن کی تلخی آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

اِس نازک اور پیچیدہ تعلق کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پاکستان کے کہنہ مشق افسر عبدالغفور چودھری نے یہ کتاب قلم بند کی ہے۔ اُن کی 39 سالہ پیشہ ورانہ زندگی جو فوج کے کڑے ڈسپلن سے لے کر سول انتظامیہ کے پیچیدہ اور سیاست زدہ ماحول تک پھیلی ہوئی ہے، وہ اِس کتاب کی بنیاد ہے۔

اُن کی خودنوشت سوانح حیات سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک ملک بھر میں غیر معمولی پذیرائی حاصل کر چکی اور اَب بیوروکریسی اور ہمارے حکمران اِس سلسلے کی ایک اہم اور جرات مند کڑی ہے جس میں بیوروکریسی کی ساخت، اُس کے کردار، اُس کی ذمہ داریوں اور اُس کے زوال کا احوال بیان کیا گیا ہے اور سیاسی قوتوں کی بیجا مداخلت کے وہ پہلو بھی بےنقاب کیے گئے ہیں جو پاکستان کی ترقی کا پہیہ بار بار روکتے رہے ہیں۔

مصنف اِس تلخ حقیقت سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں کہ جب تک بیوروکریسی سیاسی دباؤ سے آزاد رہی، تو فیصلے میرٹ پر ہوتے تھے، رشوت اور سفارش کا بازار گرم نہیں تھا اور ریاستی مشینری نسبتاً شفاف انداز میں چلتی تھی، لیکن جیسے ہی سیاسی مفادات، نجی کاروباری سوچ اور ذاتی وفاداریوں نے اداروں کے فیصلے بدلنا شروع کیے، تو بیوروکریسی کا وقار، اِس کی ساکھ اور اِس کی پیشہ ورانہ رُوح متاثر ہوتی چلی گئی۔

کتاب میں اُن غیر ذمہ دار عناصر کا بھی مکمل ذکر موجود ہے جنہوں نے اپنے عہدوں اور سیاسی پشت پناہی کا غلط استعمال کیا اور نتیجے میں ملک کی معاشی اور انتظامی بنیادیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ یہ عمل فقط سیاست دانوں کا نہیں بلکہ کچھ ایسے بیوروکریٹس کا بھی تھا جنہوں نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دی۔ مصنف نے اُن تمام کرداروں کو بےنقاب کیا ہے اور اِس پورے نظام کی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی ہے جو طاقت وروں کو بےلگام اور ایمان داروں کو بےبس کر دیتا ہے۔

آخر میں مقابلہ جاتی امتحانات (CSS/PMS) کے لیے ایک رہنما باب شامل کیا گیا ہے، جو اُن نوجوانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں جن کے پاس رہنمائی حاصل کرنے یا مہنگی اکیڈمیوں کا خرچ اُٹھانے کی استطاعت نہیں۔

یہ کتاب ایک طرف بیوروکریسی کے اندر جھانکنے کا نادر موقع فراہم کرتی ہے اور دُوسری طرف پاکستان کے انتظامی ڈھانچے کو سمجھنے والوں کے لیے ایک معتبر حوالہ بھی ہے۔ مصنف کی زبان سادہ، انداز بیباک اور مشاہدات زندگی کے تجربے سے معمور ہیں۔

بیوروکریسی اور ہمارے حکمران ہر پاکستانی کے لیے لازمی مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ریاستیں کیسے ترقی کرتی ہیں، کیسے برباد ہوتی ہیں اور کہاں کہاں وہ فیصلے ہوتے ہیں جو ایک قوم کی تقدیر بدل یا بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ کتاب حقیقت کا وہ آئینہ ہے جس میں سیاست بھی ہے، طاقت بھی، بےبسی بھی اور وہ تجربہ بھی جو ایک پوری زندگی کے سفر کا ماحاصل ہے۔

مَیں اِس کتاب کے مصنف عبدالغفور چودھری کو اِس اعلیٰ کاوش پر تہہ دل سے مبارک پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ مستقبل میں بھی ایسی کتب نذرِ قارئین کرتے رہیں گے۔

CamScanner

''تبسمِ چمنستانِ ادب'' پر ایک خوشبودار نظر

نسیم سحر/ اسلام آباد

باکمال قلمکار جناب پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی گزشتہ مہینے شائع ہونے کتاب ''تبسمِ چمنستانِ ادب'' اپنے انوکھے اور دلپذیر عنوان کے ساتھ نظر نواز ہوئی تو یاد آیا کہ مختار مسعود جیسے نابغۂ عصر قلمکار نے کئی برس پہلے ''قحط الرّجال'' کا جو گلہ کیا تھا ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہی دنوں کسی دانشور نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اب وہ سانچے ہی توڑ دیئے ہیں جن سے وہ یہ نابغے بناتا تھا۔ دونوں کی یہ قیمتی آراء اپنی جگہ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سانچے توڑنے سے پہلے دو مزید نابغے بنائے جا چکے تھے۔ اِن میں سے ایک کا اسمِ گرامی ہے اس کتاب کا موضوع اور ممدوح ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، اور دوسرا یعنی اس کتاب کا مصنف اور ممدوح کا مدّاح، پروفیسر تفاخر محمود گوندل۔ یہ اڑھائی سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب نستعلیق مطبوعات لاہور جیسے معتبر اشاعتی ادارے سے شائع ہوئی ہے جس میں بڑی معروف ادبی وتنقیدی ہستیوں کے دیباچے اور فلیپس شامل ہیں، ان نامور ہستیوں میں ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر عبد الرؤف رفیقی، جناب عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر فرحت عباس، ندیم اختر غزالی، محمد الیاس کھوکھر، محمد ضیغم مغیرہ کے ساتھ اس ہیچ مدان کی شمولیت نہ صرف ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی ہمہ جہت شخصیت کی بے پناہ ادبی وتحقیقی کام کا اعتراف ہے بلکہ مصنف پروفیسر تفاخر محمود گوندل کے منفرد اندازِ کلام اور حُسنِ کلام کا بھی اعتراف کرنا ہے۔ کتاب کے سرورق کا ذیلی عنوان ''فن، شخصیت، افکار، اوصاف ومحاسن'' بظاہر تو ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے لیے دیا گیا ہے لیکن راقم الحروف کی نظر میں یہ اسی قدر صداقت کے ساتھ جناب تفاخر محمود گوندل پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

راقم السطور بھی اس کتاب میں ایک دیباچے کے ساتھ اپنی شمولیت پر نازاں ہے حالانکہ اِن دو قد آور شخصیات کے درمیان اس ہیچ مدان کی حیثیت کچھ نہیں، اگر کچھ ہے تو بس اتنی کہ میں ان دو قطب مینار جیسی شخصیات کے روبرو یوں کھڑا ہوں جیسے باون گزوں کے درمیان کوئی بونا۔ یہ دونوں ایسی باکمال ادبی، فکری، نظریاتی اور تخلیقی شخصیات ہیں جن کے سامنے مجھ کم سخن اور کم توفیق کے الفاظ بے حیثیت تھے لیکن مدّاح کا اصرار تھا اور ممدوح کا تصوراتی یا تخیلاتی پیغام بھی کہ میں اس کتاب کی نسبت، اہمیت اور مشمولات کے حوالے سے اظہارِ خیال کروں تو اس دوہرے حکم کی تعمیل میں اپنی عجز بیانی کے ساتھ میں نے بھی ان دونوں کی محبت میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ مدّاح وممدوح کی طرح راقم السطور کو ہرگز اتنی قدرت حاصل نہیں کہ ادھر میں ''چل مرے خامے بسم اللہ'' کہوں اور خامہ بگٹٹ دوڑ پڑے۔ بہرحال اپنے تمام تر محدودات کے ساتھ کچھ کہنے کی جرأت اور جسارت کی ہے، اور چونکہ الفبائی ترکیب میں ممدوح سے پہلے مدّاح آتا ہے اس لیے پروفیسر تفاخر محمود گوندل سے آغاز کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس میں بھی ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ہی جھانکتے اور جھلکتے نظر آئیں کہ کتاب کے تمام تر مشمولات انہی کی ہمہ جہت شخصیت کے حوالے سے ہیں۔ اور یہ دونوں انتہائی قابلِ قدر اور ہمہ جہت شخصیات یہاں من تو شدم، تو من شدی کی تابندہ مثال قائم کرتے نظر آرہے ہیں۔

کائناتِ ادب میں پروفیسر تفاخر محمود گوندل کا نام کوئی اجنبی نہیں، اب تک نظم ونثر میں ان کی کم وبیش بارہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ وہ شاعری میں بھی عمدہ تخلیقی اسلوب کے مالک ہیں مگر ان کے اصل جوہر نثر ہی میں پوری طرح کھلتے ہیں۔ اقبالیات اور عشقِ رسول ﷺ اُن کے خاص موضوعات ہیں مگر ان کی تحریر کی ہمہ رنگی یہیں پر بس نہیں، دیگر موضوعات بھی جب اُن کی نوکِ قلم پر آتے ہیں تو گویا علم وبصیرت کا ایک چشمہ الفاظ کے طمطراق اور شکوہ کے ساتھ بہہ نکلتا ہے۔ اُن کی نثر نگاری میں الفاظ کی تمکنت جگمگانے لگتی ہے اور کاغذ پر موتی چمکنے دمکنے لگتے ہیں، ان کی نثر میں ابوالکلام آزاد کے نثری اسلوب کے ساتھ ساتھ جوش ملیح آبادی جیسے عظیم شاعر کی لفظی دسترس بھی شامل ہو جاتی ہے اور قاری ان کی نثر کی دلکشی اور خوبصورتی میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ وہ تحریر ہی کے نہیں، تقریر کے بھی بادشاہ ہیں اور جب وہ دونوں صورتوں میں فصاحت اور علم ودانش کے دریا بہانے لگتے ہیں تو ان کی اَدق اور پیچیدہ لفظی تراکیب بھی قاری اور سامع پر سہل ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم پر ان کی ایسی ہی موتیوں سے لکھی ہوئی تحاریر کا مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ بجائے خود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی زندگی اور تخلیقی کائنات کا بھرپور احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں شخصیات کی باہمی محبت، قربت اور ہم آہنگی کا اعلانیہ اعتراف اور اظہار کرتا

ہے۔ کتاب کے مشمولات میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے اوصاف و کمالات کا مختلف، متنوع اور ہمہ سمتی جائزہ اس خوبصورتی سے لیا گیا ہے کہ کہیں بھی تکرارِ موضوع کا احساس نہیں ہوتا۔ اور پیش لفظ میں کمال کسرِ نفسی کے ساتھ پروفیسر تفاخر محمود گوندل نے لکھا ہے کہ جیسے فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی، ایسے ہی ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو قسامِ ازل نے حقائق سے لبریز اوصاف و محاسن سے نواز رکھا ہے اس لیے مشاطۂ فطرت از خود میرے عروسِ تخیلات کو آرائشِ جمال عطا کرتا گیا۔ اس آرائشِ جمال کا احساس قاری کتاب کے پیش لفظ کے ساتھ ساتھ ہر باب، ہر سطر میں خود بخود کرتا جائے گا کہ آپ اپنا تعارف ہَوا بہاری کی ہے۔

اب کچھ ممدوح یعنی ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے بارے میں بھی کہتا چلوں کہ اِس باکمال شخصیت سے میرا غائبانہ اور بعد میں 'حاضرانہ' تعارف کم و بیش ساٹھ پینسٹھ سال پر محیط ہے جب ان کی باتصویر رپورٹیں اخبارِ جہاں اور اخبارِ خواتین جیسے معروف ہفت روزوں میں شائع ہوتی تھیں، انہی کے کونوں کھدروں میں میری بھی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ پھر بہت بعد میں اکادمی ادبیات پاکستان کی کانفرنسوں اور دیگر ادبی تقریبات میں ان سے ذاتی تعارف ہوتا چلا گیا، جس سے غائبانہ دوستی اور عقیدت مزید مستحکم ہوتی گئی۔ تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ معروف ادبی رسالے ''تخلیق'' لاہور نے یکے بعد دیگرے ہم دونوں کو ''تخلیق ایوارڈ'' جیسے قابلِ ذکر اعزاز سے نوازا تو گویا اس نسبت سے ہم ''چٹی بھرا'' بھی بن گئے۔ ۲۰۲۴ء میں بارھواں تخلیق ایوارڈ مجھے اور ۲۰۲۵ء میں تیرھواں تخلیق ایوارڈ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو ملا، اور میں نے اس موقع پر تہنیتی اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا کہ میں ان کی حیات و خدمات پر ایک مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اس مقصد کے لیے راقم السطور نے لوازمہ جمع کرنے کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ سینکڑوں کتب کے مصنف کے بارے میں یہ لوازمہ ایک ضخیم دفتر کی صورت اس وقت میری میز کی زینت ہے۔ اگرچہ اب پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی یہ کتاب پڑھ کر سوچ رہا ہوں کہ میں وہ اندازِ بیان، وہ حسنِ اظہار کہاں سے لاؤں گا جس سے الفاظ میں وہ کچھ بیان کر سکوں جو نہاں خانۂ دِل میں مکیں ہے،، لیکن مولانا حسرت موہانی کا یہ مصرعہ: ''مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی'' ذہن میں رکھ کر یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ بڑے لوگ عقیدت و محبت میں گندھے ہوئے سادہ الفاظ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی کہ پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی ان موتیوں سے جڑے الفاظ کو۔ اس لیے یہی خیال میری ہمتوں کی پستی کو بھی میرے شوق کی بلندی تک آمادۂ پرواز رکھے ہوئے ہیں۔

ایک اور بات اس کتاب کی نسبت سے کہنا ضروری ہے۔ پروفیسر تفاخر محمود گوندل نے اس کتاب کے آخری باب میں ''افکارِ تبسم'' کے عنوان سے تقریباً چھیالیس صفحات پر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے چار سو چھیالیس دانش پارے شامل کیے ہیں۔ ان میں سے ہر دانش پارہ قاری پر یکے بعد دیگرے غور و فکر اور اوجِ خیال کے دریچے وا کرتا جاتا ہے اور ہمیں بتاتا جاتا ہے کہ کوزے میں دریا نہیں بلکہ سمندر سمیٹ لینے کا ہنر کیا ہوتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس باب میں مقطعے کے طور پر ایک اور دانش پارہ (نمبر چار سو سینتالیس) میری طرف سے شامل ہو جائے جس سے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سے مخاطبت اور رابطہ رکھنے والا ہر شخص آگاہ ہے، وہ ہے اُن کے لب پر ہمہ وقت رواں رہنے والا یہ حب الوطنی سے لبریز کلمہ ''پاکستان: زندہ باد''۔ آپ جب اور جس وقت بھی ان سے بالمشافہ یا ٹیلی فون پر محوِ گفتگو ہوں تو ان کے آخری الفاظ جو کہ ان کی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں یہی ہوتے ہیں کہ ''پاکستان: زندہ باد''۔ لیکن میرا جی کرتا ہے کہ میں پاکستان کے ساتھ ساتھ اس سچے پاکستانی کو بھی شامل کر کے یہ کہوں: پاکستان: زندہ باد: ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم: زندہ باد!!

جی تو چاہتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں جن نامور ہستیوں کے دیباچوں اور فلیپس کا ذکر کیا ہے اُن کی گراں قدر تحاریر مقتبس کر کے یہاں پیش کی جائیں لیکن مضمون کی طوالت آڑے آ رہی ہے۔ چنانچہ میں ان دونوں نابغہ عصر شخصیات کے لیے اس دُعا پر اپنا یہ اظہاریہ تمام کر رہا ہوں کہ خدا کرے وہ دونوں یونہی اپنی تخلیقی زرخیزی اور فنی دسترس سے تحقیق و تنقید و تخلیق کے خطوں کو شاداب و سرشار رکھیں۔ آمین۔

✧✧✧

مقبولِ عام ادیبوں کا المیہ

ناصر عباس نیرّ/ لاہور

مقبولیت کی آرزو کسے نہیں؟

ایک تلخ سچ یہ ہے کہ یہ آرزو انھیں بھی ہے جو گم نامی کی زندگی کی مدح کیا کرتے ہیں؛ وہ اپنی گمنامی کی شہرت چاہتے ہیں۔

کچھ اپنی بدنامی کو بھی شہرت و مقبولیت کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ بے غرضی و بے نیازی کی اقدار کا مسلسل چرچا کرنے والے بھی غرض مند ہوا کرتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ انسانی آرزوؤں کے اظہار کی کوئی ایک زبان ہے، نہ کوئی ایک پیرایہ۔ نفی کے صیغے میں اثبات ہوسکتا ہے اور خاموشی کے پیرائے ... اور پردے میں کوئی چیختی، گونجتی ہوئی آرزو ظاہر ہونے کے لیے بے تاب ہوسکتی ہے۔ کئی بار غیر مقبول باتوں کا ذکر بھی مقبول ہونے کا حربہ ہوا کرتا ہے۔

مقبولیت کی آرزو کیا ہے؟ دوسروں کے ذہنوں، دلوں اور یادوں میں اپنا عکس دیکھنا؛ صفحے، سکرین، دیوار اور لوحِ زمانہ پر اپنا نقش دیکھنا۔ اپنی ذات کو غیر ذات میں جابجا دیکھنا۔ جب یہ عکس و نقش واقعی نظر آنے لگتے ہیں ،یعنی کوئی شخص واقعی شہرتِ عام حاصل کرلیتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ یعنی مقبولیت کا تجربہ اپنی اصل میں کیا ہے؟

اگرچہ ہر مقبول و مشہور شخص کے لیے یہ تجربہ الگ ہوا کرتا ہے، اور اتنا ہی الگ ہوا کرتا ہے، جتنے الگ وہ ذرائع ہوتے ہیں، جن کی مدد سے مقبولیت ملا کرتی ہے۔ ذرائع حقیقی اور جائز ہوتے یا ان کے برعکس۔ تاہم مقبولیت کے تجربات میں کچھ باتیں بہ ہر حال مشترک ہوتی ہیں۔

مقبولیت کے جملہ تجربات میں مشترک بات یہ ہے کہ یہ ایک طرح کا اقتدار ہے۔ مقبول عام شخص ایک مقتدر شخص میں بدل جاتا ہے۔ وہ دوسروں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور پوزیشن اصل کرلیتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اثر انداز ہونے کی یہ صلاحیت اسے حاصل تو اس کے کام کے سبب ہوتی ہے، مگر بہت جلد یہ صلاحیت، اس کے کام سے الگ ہوجاتی ہے، اور اس کے مقبول عام ہونے کے امیج سے وابستہ ہوجاتی ہے۔ اس کے کام سے بڑھ کر، اس کا نام اثر انگیزی کا حامل ہوجاتا ہے۔

وہ صرف اپنے قارئین کے دلوں اور ذہنوں ہی پر اثر انداز نہیں ہوتا، معاصر مقتدر لوگوں، فیصلہ سازوں اور پالیسی سازوں پر بھی اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ کسی مسئلے، متن، آدمی پر اس کی رائے یا تبصرہ رائیگاں نہیں جاتا۔ اسے صرف توجہ سے سنا ہی نہیں جاتا، اس کے ایک ایک لفظ کو باقاعدہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک مقبول عام ادیب، ایک بہ ظاہر دکھائی نہ دینے والی سلطنت کا امیر ہوا کرتا ہے۔

بلاشبہ مقبولیت عامہ، اقتدار ہے۔ اقتدار کی جہاں اپنی لذت ہے، وہاں اس کے اپنے خطرات ... اور تضادات بھی ہیں۔ اس شیرینی میں ایک زہر بھی موجود ہے۔ (ویسے تو کوئی شیرینی، خود بھی زہر سے کم نہیں)۔

ہر مقتدر شخص کو اپنے اقتدار کے چھن جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ مقتدر شخص کا دل، خوف اور بزدلی کی آماج گاہ ہوتا ہے۔ اسے وہ چھپانے کی کوشش، سازش اور اداکاری کرتا ہے۔ کئی بار اس کی کوشش اور سازش سفاکانہ ہوجایا کرتی ہے۔ وہ اپنی طاقت کا مہلک استعمال کرلیا کرتا ہے۔

ایک مقبول و مقتدر ادیب کو پہلا خطرہ دوسرے مقبول و مقتدر ادیب سے ہوا کرتا ہے۔ دو مقبول و مقتدر ادیب کبھی دوست نہیں ہوسکتے۔ اقتدار، شراکت پسند نہیں کرتا۔ مقتدر شخص، جبلی طور پر جانتا ہے کہ شراکت، معزولی کی تمہید ہوسکتی ہے۔

مقبول و مقتدر ادیب کو دوسرا خطرہ ان سے ہوتا ہے، جن پر وہ حکمرانی کرتا ہے۔ یعنی قارئین وسامعین۔ کہیں وہ اپنا رخ نہ بدل لیں؛ اس سے بد دل نہ ہوجائیں؛ اس کے خلاف بغاوت نہ کردیں۔ لہٰذا وہ انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ باتیں لکھتا اور کہتا ہے، جس سے اس کے کام پر مسلسل لکھا جاتا رہے اور تالیاں بجتی رہیں۔ جس بات، پیرائے، موضوع سے اسے مقبولیت ملی تھی، وہ انھی کو ،زبانی و قلمی طور پر دہراتا چلا جاتا ہے۔

مقتدر و مقبول عام شخص لاکھ قناعت کا درس دیں، ان کے دل اپنی مقبولیت و اقتدار کو مزید بڑھاتے چلے کی ہوس سے بری طرح آلودہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک اعزاز، کسی ایک مسند، کسی ایک ستائشی تبصرے، ان کی خدمات پر لکھی گئی کسی ایک کتاب پر کبھی قانع نہیں ہوا کرتے۔ وہ ہر اس جگہ خود کو بلاشرکت غیرے دیکھنا چاہتے ہیں، جو واقعی موجود ہے یا موجود ہوسکتی ہے۔ وہ صرف جیتے جی شہرت عام ہی نہیں، بقائے دوام بھی چاہتے ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے اپنے نوبیل تقریر میں ایک طالوی شہزادے کا ذکر کیا ہے۔ وہ جب بسترِ مرگ پر تھا تو اس سے پادری نے پوچھا کہ کیا اسے کوئی تاسف ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں، ایک بات کا اب تک قلق ہے کہ ایک بار میرے پاس پوپ اور شہنشاہ دونوں آئے۔ میں انھیں اپنے مینار کی چوٹی پر لے گیا تاکہ انھیں وہاں سے شہر کا نظارہ کراسکوں۔ یہ ایک زبردست موقع تھا، جسے میں نے گنوا دیا، اسی کا قلق ہے۔ اگر میں انھیں وہاں سے دھکا دے دیتا تو مجھے ابدی شہرت مل جاتی۔ مقتدر آدمی، آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی اپنے اقتدار ہی کا سوچتا ہے۔

مقبول عام ادیب اپنی ہی بنائی ہوئی ڈگر سے ہٹتے ہوئے، باقاعدہ خوف محسوس کرتا ہے۔ ایک اندوہ

حکمرانی نہیں کرتا، قارئین وسامعین اس کے ذہن وتخیل پر حکمران بن جاتے ہیں۔

وہ انھیں اپنی طرف متوجہ رکھنے ،یعنی اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے، نئی ،انوکھی ، غیر مقبول بات کہنے سے باقاعدہ خوف زدہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کسی کارنامے کا ذکر خود اپنی زبانی سیکڑوں بار کرنے سے نہیں شرماتا۔ وہ خود پسندی وخود مدحی کی بلند ترین چوٹی پر جانے میں قباحت نہیں دیکھتا۔

وہ معمولی سی تنقید اور ذرا سی چبھتی ہوئی بات بھی برداشت کرنے کے حوصلے سے محروم ہوجاتا ہے۔ وہ سوال سے گھبراتا ہے اور غیر مشروط مداحوں میں گھرا رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ مداح، اپنی رائے دینے میں سفاک نقادوں کے مقابلے میں ،اس کی ڈھال ہوتے ہیں۔ نقادوں کا فوبیا سب سے زیادہ، مقبول عام ادیبوں یا مقبول ہونے کی آرزو رکھنے والوں کو ہوا کرتا ہے۔

تاہم ایک مقبول عام ادیب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تنہائی سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس کے آس پاس ہی نہیں، اس کی یادداشت وتخیل میں بھی، اس کے مداحوں کا جم غفیر رہتا ہے۔ تخلیق، تنہائی اور وحشت چاہتی ہے۔ ہر بار ایک نئی تنہائی، اور ایک نئی وحشت۔ دنیا، سماج اور انسانی روح کے ان دیکھے منطقوں میں بے دھڑک جانے کی وحشت، اور ان منطقوں کو تنہا کھوجنے کا حوصلہ۔ اور اس بات کو یکسر بھول جانے کی وحشت کہ آدمی کے لکھے کو کون پڑھے اور سراہے گا اور کون نہیں۔

آخری بات۔ مقبول عام ادیب کا المیہ صرف ذاتی نہیں رہتا، اس کے قارئین وسامعین کا بھی بن جاتا ہے۔ وہ اپنی مقبول عام تحریروں، باتوں کو مسلسل دہراکر اپنے قارئین وسامعین کو ایک ہی ڈھب سے سوچنے اور محسوس کرتے چلے جانے کا عادی بنادیتا ہے۔

بڑے سے بڑا خیال بھی جب عادت بن جائے تو وہ خیال نہیں رہتا، پتھر بن جاتا ہے۔ خیال تو بہتی ندی ہے!

انجینئر ظفر محی الدین/ لاہور

خدائی ساری خدا کی ، خدا قلندر کا
کہ ٹالتا نہیں وہ بھی کہا قلندر کا

ہزار نقطۂ امکان کھل گئے یک دم
جہاں بھی کام ذرا سا رُکا قلندر کا

حجابِ عقل وخرد سے پرے ہے جس کا سفر
وہ فیض ہم کو ہوا ہے عطا قلندر کا

ریاضِ سیر و سلوک و جنون و استغنا
ہے قطبِ دہر میں نقشِ بقا قلندر کا

فقیرِ وقت ہے ، گدی نشیں معانیٔ قلب
کہ لفظ عشق ہے لکھا ہوا قلندر کا

حجاب عقل کو شرمندہ کر رہا ہے عشق
فرازِ طور پہ ہے ماجرا قلندر کا

کھلے ہیں بابِ رموزات، لامکاں کے سبب
خودی کا سرِ نہاں آئینہ قلندر کا

طلسمِ وقت کے پردے میں جاگزیں اسرار
کھلا ہے بابِ حقیقت ، صدا قلندر کا

حضورِ ذات میں گم ، بے خودی کے عالم میں
میں لکھ رہا ہوں ظفر تذکرہ قلندر کا

✦✦✦

Translogic International
Translate.connect.inspire
انگریزی سے اردو کتب کا معیاری ترجمہ
ہم آپ کے خیالات کو بامعنی الفاظ میں ڈھالتے ہیں
خدمات:
ہر موضوع پر اعلیٰ معیار کے تراجم
کتاب نویسی اور مواد کی تیاری میں مکمل معاونت
اشاعت کے تمام مراحل میں پیشہ ورانہ رہنمائی
100% رازداری اور معیار کی مکمل ضمانت
اپنی تخلیق کو عالمی زبان میں متعارف کروائیں
Translogic Intl کے ساتھ!
فیروز سینٹر، غازی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
C.E.O: حسن محمود 0300-4489310

نستعلیق مطبوعات
اردو ادب کے فروغ کا معتبر نام
پاکستان کا وہ ادبی ادارہ جو اب تک مختلف موضوعات پہ
چھ سو سے زائد کتب شائع کر چکا ہے
معیار، نفاست، اور اعتماد کی پہچان!
آپ بھی اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت
کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔ ہم فراہم کرتے ہیں:
کتاب کی ترتیب وتزئین
طباعت واشاعت کے جدید تقاضے
مارکیٹنگ اور تشہیر میں پیشہ ورانہ معاونت
نستعلیق مطبوعات
فیروز سینٹر، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0316-4195471 / 0300-4489310
nastalique786@gmail.com

ذات سے کائنات تک

قیصر نجفی

درج ذیل مضمون کا آغاز ایک ایسی تمہید سے ہے جو ہمارے ایک دوسرے مضمون کی بھی تمہید ہے۔

''غزل کی معرفت کے نور سے معمور ذہنوں کے حامل اس تاریخی حقیقت سے آگاہ ہیں کہ متقدمین، متوسطین، متاخرین بالخصوص جدید غزل کے اساتذۂ فن نے اپنے اپنے طور پر غزل کے نئے نئے اسالیب کے چراغ روشن کیے۔ میر تقی میر نے غزل میں درد و غم اور سوز و گداز کی طرزِ نو سے جوت جگائی۔ خواجہ میر درد نے غزل کے مروجہ انداز کے برعکس ایک نئے قرینے سے تصوف کی روشنیاں پھیلائیں۔ غالب نے جدت طرازی اور فکر و فلسفہ کی تجلیات سے غزل کو رخشاں و درخشاں کیا۔ مومن خان مومن نے غزل نہیں کہی گویا شمع روشن کی جس نے تغزل کا راستہ منور کیا۔ جدید شعراء نے فکری، فنی، لسانی غرض ہر نوع کی تازہ کاری کی جلوہ نمائیوں سے اردو غزل کی کایا پلٹ دی۔ اس حوالے سے دو ایک نام نہیں، کئی شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے قدامت پسندی کا طلسم توڑا اور اسلوبیاتی، موضوعاتی اور موادیاتی سطح پر آسمانِ غزل کو نئی نئی کہکشاؤں سے روشناس کرایا۔ یہ صورتِ حال یعنی نئے نئے اسالیب کی تلاش و جستجو کا سلسلہ اساتذۂ فن کے خوشہ چینوں کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے بھی غزل کو نو بہ نو پیراہن پہنانے کی کاوشیں جاری رکھیں۔ اس تناظر میں بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن فی الوقت ہمارے ذہن میں ایک نام ماہِ چہاردہ کی طرح جگمگ کرنے لگا ہے اور جو ہمارے پیش نظر موضوع کا نقطۂ ارتکاز ہے۔

اس سے قبل کہ ہم موضوع کے حوالے سے کچھ رقم کریں ہم مغرب کے ایک دانشور ایمرسن کے قول کا حوالہ دینا ناگزیر سمجھتے ہیں جو ہمارے موضوع کا محرک قرار دیا جا سکتا ہے:

"Never loose an opportunity to see the thing which is beautiful. For beauty is God's writing and a way side sacrament."

Welcome it in every fair face every fair flower, every fair sky and thank God as a cup of blessings."

ہمارے نزدیک نذیر قیصر حسن کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا ہر مصرعہ حسن کا ترجمان ہے۔ وہ حسن انسان کا ہو، چرند یا پرند کا ہو، نباتات کا ہو یا جمادات کا غرض جیسا کہ ایمرسن نے کہا ہے: "Beauty is God's hand writing" جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کو حسن پسند ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں خود اللہ تعالٰی نے کیا ہے: ''اللہ کو جمال پسند ہے اس لیے کیونکہ وہ خود جمیل ہے۔''

زیرِ تبصرہ موضوع کی اہمیت اس حوالے سے اور بڑھ جاتی ہے کہ نذیر قیصر کی شاعری دورِ جدید کے انسانی مسائل کا نہایت گہرا تجزیہ بھی ہے۔

نذیر قیصر ہمارے عہد کے معدودے چند ان شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے قارئین کو ایک نئی دنیا اور ایک نئے انسان سے متعارف کرایا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ نذیر قیصر کا مطالعہ فطرت اتنا وسیع ہے کہ انہیں چند انگریزی شعراء کی طرح شاعرِ فطرت کہا جا سکتا ہے۔ ناقدین کے مطابق انگریزی شاعر Wordsworth نے فطرت کو Spiritualise کیا۔ Shalley نے Intellectualise کیا۔ جب کہ Keats نے Picturise کیا اور حسن اتفاق یہ ہے کہ فطرت کی عکاسی کے مطابق یہ ساری خوبیاں نذیر قیصر کی شاعری کا بھی سنگھار ہیں۔ Wordsworth نے تو یہ تک دعویٰ کیا ہے کہ فطرت ان سے باتیں کرتی ہے:

گفتگو بھی ہو کچھ درختوں سے
اور تھوڑی سی سیر ہو جائے
مجھ سے لپٹے اگر وہ شاخِ غزل
رات بھر میں ہری بھری ہو جائے
تیرے باغوں میں مینہ برستا ہوا
رنگ اور دھول میں اٹا ہوا میں
پھولوں بھری بیلیں کھڑکی میں اچھی لگتی ہیں
بیلوں میں پہلی کا چاند بنانا ہوتا ہے
لپٹتی ہیں جو بیلیں بام و در سے
نوشتہ ہے کوئی ارض و سما کا

بقول پروفیسر امجد علی شاکر ''اب مشین کا شور اتنا ہے کہ بلبل کی صدا کون سنے اور سڑکوں پر اتنی بھیڑ ہے کہ پھولوں کو دیکھنے کے لیے کسی باغ میں کوئی کیسے جا سکے۔ حسرت اور فراق وغیرہ نے محبوب کی ارضی سطح دریافت کر لی تھی۔ اب محبت کی ارضی سطح اور اس کے ساتھ ہی کاروباری سطح بھی دریافت ہو رہی ہے۔ اب محبوب کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ شخص، وطن اور دھرتی میں سے کوئی بھی محبوب ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس انداز میں دھرتی سے عشق ہوگا وہ فرد کی محبت کے انداز سے تو جدا ہوگا۔''

نذیر قیصر کے یہاں آج کے دور کی عکاسی کس انداز میں کی گئی ہے یا کی جاتی ہے اس کی تفسیر کچھ اس انداز میں کی گئی ہے۔

یہ جو دیوار و در میں شور سا ہے
سب ہمارا کہا سنا ہوا ہے
تجھ سے ملنا ہو یا بچھڑنا ہو
جو بھی ہو سب ہنسی خوشی ہو جائے

نئی پیوند کاری ہو رہی ہے
لباس غم پرانا ہو گیا ہے
یہ جو شکنیں پڑی ہیں چہرے پر
آئینہ ٹوٹ کر جڑا ہوا ہے

ایک ممتاز شاعر عبیداللہ علیم کے بقول ''ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ عقیدے موجود ہیں اور تہذیب مٹ گئی ہے۔ تہذیب کے بغیر عقیدے کا وجود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ پھر عقیدے انسانوں کو نگلنے لگ جاتے ہیں۔ یہ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے بجائے زندگی کے ہی دشمن ہو جاتے ہیں۔''

نذیر قیصر ایک روادار شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے دوستی، محبت، رواداری، انسانیت کا درس دیا ہے۔ درج ذیل اشعار میں انہوں نے اپنے مسلک کا اظہار کر دیا ہے:

دل سے دنیا نکال دی میں نے
آگ کاسے میں ڈال دی میں نے
پیاس چھلکی تھی میری چھاگل سے
آسماں تک اُچھال دی میں نے

صحیفہ ہے زمیں رنگ و صبا کا
کوئی مذہب نہیں میرے خدا کا
محبت آیت لوح ابد ہے
یہی مسلک رہا ہے انبیاء کا

نذیر قیصر انسانی عظمت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کا انسان وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہتا ہے۔

میں شاعر ہوں خواب میں جاگ کے چلنا رہتا ہوں
میں نے اپنے خواب سے آگے جانا ہوتا ہے
چاند نیا ہے اور دنیا کی آنکھیں بوڑھی ہیں
دنیا کو پیالے میں چاند دکھانا ہوتا ہے
رات کو مشعل لے کر جو غاروں میں اُترتا ہے
اس بندے کے اندر کوئی خزانہ ہوتا ہے

سب کے ہاتھوں میں مٹی کی تختی ہوتی ہے
مٹی کی تختی پر نام لکھانا ہوتا ہے

نقش پا ہیں مرے ستاروں پر
وقت کو اپنی چال دی میں نے

نذیر قیصر کی نظر صرف دور حاضر پر نہیں بلکہ وہ تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے کئی دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کی اپنے کلام میں تصویر کشی کی ہے۔ جیسے یاس یگانہ اپنے ایک شعر میں شاعر کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

کرشن کا پجاری ہوں علی کا بندہ ہوں
یگانہ شان خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

نذیر قیصر یہ فرماتے ہیں:

کرشن بھی سانولا ہے گو تم بھی
بت کدہ راکھ سے بنا ہوا ہے
کربلا سے یروشلم کا سفر
اک ستارے نے طے کیا ہوا ہے

ہر چند نذیر قیصر ایک مثبت فکر کے شاعر ہیں۔ مگر انہوں نے کچھ منفی مزاج رکھنے والی چیزوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے تا کہ مثبت فکر رکھنے والے اصل حقیقت جان سکیں:

فاختہ اُڑ رہی ہے ٹینکوں پر
توپ میں گھونسلا بنا ہوا ہے
پلٹ جاتی ہے دستک دے کے دنیا
میں دروازہ ہوں خوابیدہ سرا کا

اگر اختصار سے کام لیا جائے تو ہم نذیر قیصر کی تہ داری، معنویت، شگفتگی اور شعری کمال کو سراہے بغیر تبصرے کا اختتام نہیں کر سکتے۔ انہوں نے معاشرتی حقائق کا اپنے کلام میں جس فنی شعور سے تجزیہ کیا ہے اس بنا پر وہ دور حاضر میں ایک بڑے شاعر ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

اجمل ساقی

پھولوں کے صحیفوں میں لکھا اور ہی کچھ ہے
ہم حسن پرستوں نے پڑھا اور ہی کچھ ہے

کچھ اور بتائی گئی اس کی حقیقت
دراصل حقیقت میں خدا اور ہی کچھ ہے

ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں رقص میں لو کو
جب اپنے جنوں میں ہو دیا اور ہی کچھ ہے

بے اشک اگر ہو تو فقط لفظ و معانی
شامل ہوں اگر اشک دعا اور ہی کچھ ہے

تم چاند کو دیکھو کبھی آدھا کبھی پورا
کہتے ہیں جسے ہجر بلا اور ہی کچھ ہے

اس بار معافی سے نہیں بات بنے گی
اس بار مجھے تجھ سے گلہ اور ہی کچھ ہے

طوفان بلا خیز میں آیا ہے وہ ملنے
جو میں نے کہا اس نے سنا اور ہی کچھ ہے

آدم کی سزا مجھ کو سنائی گئی کیوں ہے
اے میرے خدا میری خطا اور ہی کچھ ہے

مفرور کسی اور اذیت میں ہے ساقی
پابند سلاسل کی سزا اور ہی کچھ ہے

CamScanner

ادبی گروہ بندیاں اور معاصرانہ چشمک

ظہیر گیلانی / اسلام آباد

گروہ فارسی زبان کا لفظ ہے جسکے کئی معنی ہیں مثلاً جماعت، آدمیوں کا جتھا، ٹولی، منڈلی، فرقہ، جرگہ لشکر، گچھا، جھنڈ، قسم، درجہ، صنف، جنس پرندوں کا غول، پرا، ٹکڑی وغیرہ۔ انگریزی لفظ گروپ کا ترجمہ بھی اردو میں عام طور پر گروہ ہی کیا جاتا ہے۔ جو بعض اوقات مناسب نہیں لگتا۔ لیکن کوئی اور بہتر متبادل بھی سامنے نہیں آیا۔

بندی کے معنی قیدی، اسیر، غلام پابند وغیرہ ہے۔ ادبی گروہ کا مطلب ہوا کہ ایسے ادیبوں کا گروہ جو کسی ادبی شخصیت، یا نظریہ یا ادبی صنف وغیرہ کے اصولوں کے پابند ہوں۔

ہمارے اردو روزمرہ میں گروہ بندی کی ترکیب سے کچھ زیادہ مثبت تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ گروہ کا لفظ ٹھگوں، چوروں اور ڈاکوں وغیرہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ادب جیسی لطیف چیز کے ساتھ گروہ کا لفظ خاصا ثقیف سا لگتا ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے بہت سے اہل ادب گروہ بندی کا شکار رہے ہیں۔ اور بہت دیر سے ہیں۔ یعنی ادبی گروہ بندی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

گروہ بندی کے لیے معاصرانہ چشمک کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی ہے۔ میر و سودا، انشا و مصحفی، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، غالب اور استاد ذوق سمیت کتنے ہی اساتذہ سخن کے درمیان معرکوں کے قصے ادبی حلقوں میں مشہور ہیں۔ ماضی قریب میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی چشمک ہم میں سے اکثر نے دیکھی یا سنی ہے۔ نثر نگار بھی گاہے گاہے ایسے میدان کارزار سجاتے رہے ہیں۔

اس چشمک کی ایک وجہ شعرا کا اپنے کمال فن پر ایک گونہ غرور و گھمنڈ بھی رہی ہے کہا جاتا ہے کہ میر تقی میر سے لکھنو میں کسی نے پوچھا۔ " کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے۔" میر صاحب نے کہا۔ "ایک تو سودا ہے اور دوسرا یہ خاکسار، اور پھر کچھ تامل سے بولے، آدھے خواجہ میر درد۔ ''اس شخص نے کہا، "حضرت، اور میر سوز؟" میر صاحب نے چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ "میر سوز بھی شاعر ہیں؟" اس نے کہا۔ " آخر نواب آصف الدولہ کے استاد ہیں۔" کہا۔ "خیر اگر یہ بات ہے تو پونے تین سہی۔"

شعرا کے درمیان ادبی معرکے تو ہوتے ہی رہتے تھے لیکن جب یہ چھیڑ چھاڑ علم و فن کے دائرے سے نکلی تو اس نے ذاتیات کی صورت اختیار کر لی اور بعض صاحبانِ کمال کی جانب سے نہایت پستی کا مظاہرہ بھی ہوتا رہا ہے۔

ادب اور خصوصاً شاعری ایسی چیز نہیں جس میں اوج کمال کسی مدرسے، سکول، کالج یونیورسٹی میں تعلیم کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکے۔ ہاں یہ ادارے مبادیات، اصول، ضابطے، قوائد کی تعلیم دے سکتے ہیں جن سے ادب میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔

مختلف علوم کے حصول سے ذہنی بلوغت اور سوچ میں گہرائی پیدا ہو سکتی ہے لیکن بنیادی چیز افتاد طبع، خداداد قابلیت، محنت، اور ذوق و شوق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اچھا، قابل اور شفیق استاد بھی مل جائے تو ترقی کی منازل تیزی سے طے ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے شعرا اپنے اپنے زمانے کے باکمال شعرا سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ اس طرح کی استادی - شاگردی کی روایت ہمارے شعری ادب میں بہت مظبوط رہی ہے۔ نوآموز شاعروں کے لیے تو کسی استاد کی راہنمائی حاصل کرنا بہت ہی اہم ہے۔ دوسری طرف بڑا استاد بھی اسی کو جانا جاتا رہا ہے جس کے شاگرد زیادہ ہوں۔ اس طرح ایک ایک بڑے شاعر کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی تھی۔ یہ استاد مشاعروں وغیرہ میں بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ جاتے تھے۔ اس طرح گروہ بندی شروع ہوتی اور اساتذہ میں کسی اختلاف رائے کی صورت میں گروہی صف بندی کی شکل اختیار کر لیتی۔ اگر شاگردوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء نہ ہوں تو پھر ان کا مصرف ہی کیا ہے۔ استاد یعنی جرنیل طبل جنگ نہ بھی بجائے تو شاگرد بہر حال اپنے تیر و تفنگ تیار رکھتے تھے اور اپنے محبوب قائد کے چشم و ابرو کے ہلکے سے اشارے پر دونوں طرف کے سپاہی تلواریں سونت لیتے تھے۔ یہ جنگ جرنیل ادبی موشگافیوں سے لڑتے اور سپاہیوں کی یلغار ہلہ گلہ، فقرے بازی، ہوٹنگ وغیرہ سے ہوتی تھی اور عموماً مشاعرے کے اختتام پر عارضی جنگ بندی ہو جاتی تھی۔ یہ جنگ اساتذہ کے روبرو تو ہوتی تھی لیکن دو بدو ایک گروہ دوسرے سے دو دو ہاتھ کرنے کی جسارت کم ہی کرتا تھا، ہو بھی جائے تو بیچ بچاؤ کروانے کے لیے منتظمین اور سامعین تو موجود ہی رہتے تھے۔ یہ جھڑپیں اکثر بڑی جنگوں کا سبب بھی بن جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کشیدگی بڑھ کر استادوں اور شاگردوں کے لئے خاصی پریشانی اور ذلت کا سبب بھی بن جاتی تھی مثلاً انشا اور مصحفی کی کشیدگی اتنی بڑھی

CamScanner

کی اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ ایک دوسرے کے گھروں کی طرف مارچ کرنا پڑا۔ اس قسم کی مہم جوئی میں عام طور پر مخالف فریق کا مضحکہ اڑایا جاتا اور سوانگ رچائے جاتے تھے۔ بعض دفعہ یہ ہنگامہ خیزی الٹی بھی پڑ جاتی تھی۔ جیسے مصحفی اور انشا کی معاصرانہ چشمک نے چپقلش کی صورت اختیار کی اور گروہی تصادم کا خطرہ نواب صاحب کی ناراضگی کا سبب بنا اور یہ ناراضگی انشا جیسے عظیم القدر شاعر اور صاحب فن کی دربار عالی سے برخاستگی اور رسوائی پر منتج ہوئی۔ اس طرح کی محاذ آرائیاں عموماً ادبی خدمت کے جذبے سے سرشار ایک استاد کا دوسرے استاد کی جبری اصلاح کی کوشش یا اپنے ادبی مقام کو اونچا کرنے اور حاکم وقت، نواب، والی ریاست یا ماہرین فن کی نظروں میں نام نہاد حریف کی حیثیت گرانے کے لیے برپا کی جاتی تھیں۔

آج کے زمانے میں ادبی گروہ بندیاں تو موجود ہیں بلکہ مظبوط تر ہیں لیکن شکر ہے کہ معاصرانہ چشمک کی یہ صورت اب موجود نہیں ورنہ مشاعروں پر بم دھماکے اور طالبان (شاگردوں) کے خودکش حملے ہوا کرتے۔

پرانی طرز کی گروہ بندیاں تو ریاستوں اور والیان ریاست کے ساتھ ہی معدوم ہوتی گئیں لیکن نئی نئی اقسام کی ادبی گروہ بندیوں نے جنم لے لیا ہے۔

نظریاتی گروہ بندی نے اردو زبان کی تحریکوں کے ساتھ جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک بہت بڑی ادبی تحریک کے طور پر اُبھری تو اشتراکی نظریات رکھنے والے ادیبوں کا ایک مظبوط گروہ وجود میں آ گیا۔ یہ گروہ نہ صرف ادب برائے زندگی کا علم بردار تھا بلکہ ادیبوں کے سیاست میں براہ راست حصّہ لینے کا بھی حامی تھا۔ ہماری سیاست میں ادیبوں، دانشوروں،، سماجی کارکنوں وغیرہ کا داخلہ کبھی بھی آسان نہیں رہا۔ اگر ایسا کوئی شخص سیاست میں کود ہی پڑا تو اپنے پرائے سیاست دانوں نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ ایک نازک طبع ادیب کے لیے اس فضا میں سانس لینا بہت محال ہے۔

پھر ایک "مجلس داستان گویاں" نے جنم لیا جس میں کچھ عرصہ بعد شعراء بھی شامل ہوگئے اس طرح "حلقہ احباب ذوق" ایک مظبوط تنظیم کے طور پر وجود میں آیا۔ جو ادب میں جدیدیت کی تحریک کا علم بردار تھا۔ حلقہ بھی کچھ عرصہ اندرونی گروہ بندی کا شکار رہا ہے۔ ان گروہوں کے مابین اسلامی ادب تحریک چلتی رہی۔ جو اسلامی نظریہ کی علم بردار رہی۔

نو آموز ادیبوں کو ہمیشہ ہی بڑوں کی سرپرستی کی ضرورت رہی ہے۔ اب استادی شاگردی کا قدیم انداز تو شاید اب قائم نہیں رہا۔ لیکن اب یہ بڑی شخصیات، ادبی جریدوں اور اخبارات، ورسائل کی گروہ بندی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ کچھ تنظیمیں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ کچھ تنظیمیں بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہیں۔ ان گروہوں کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ادیبوں کو کچھ راہنمائی ملتی رہتی ہے۔ دوسرا فائدہ یا نقصان یہ ہے کہ ان کی پشت پناہی سے مشاعروں میں شرکت کے دعوت نامے، ادبی ایوارڈز کے لیے نامزدگی وغیرہ حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اگر ان سرپرستوں کا دست شفقت سر پر نہ ہو تو اعزازات تو دور کی بات ہے، کسی کو ادیب ہی نہیں مانا جاتا تا کہ ادیب کی تخلیقات اور جیب دونوں میں بہت جان ہو اور ادیب اپنی شناخت خود بنالے۔

راؤ وحید اسد

جہاں سے ہم گزر جائیں وہ سب آثار بولیں گے
ہمارے اک اشارے پر در و دیوار بولیں گے
ہماری شہرتوں پر کوئی بولے یا کہ نہ بولے
پس۔ پردہ حسد میں سب ہمارے یار بولیں گے
ابھی تو ظرف ہے میرا کہ میں خاموش بیٹھا ہوں
جو میں بولا تو پھر یہ شہر کے اخبار بولیں گے
جہاں پر بولنا ہوگا وہاں پر چپ رہیں گے لوگ
جہاں خاموش رہنا ہو وہاں بے کار بولیں گے
تمھارے لمس کی دوری ہے جو یہ ناتوانی ہے
وگرنہ تم جو چھو لو تو ترے بیمار بولیں گے
مری لشکر کشی پر میرا دشمن صبر کر لے گا
مجھے یہ علم ہے لیکن سبھی غدار بولیں گے

ایاز احمد/لاہور

تو باوفا کب تھا، مجھے پاسِ وفا کب تھا
میں تیرا ہی کیوں رہتا، بھلا تو مرا کب تھا
ہونے سے ترے باغِ بہاراں گُلِ تازہ
جانے پہ ترے لب پہ بھی شکوہ بھلا کب تھا
تم پاس بلاتے تو سہی آگ جلاتے
دائم تھا پڑا در پہ ترے میں تو گیا کب تھا
دل ہے ہی کہاں ورنہ دکھاتا تجھے آتش
جلتا رہا شعلہ جو بچا تھا بجھا کب تھا
لے داغِ جگر، دودِ چراغِ دلِ حسرت
ہم جائیں کہاں، آتا بھی اور راستا کب تھا
سننے کو کہاں سنتا ہے دل اپنی ایاز اب
دم تھا جو نکل کر دمِ عیسیٰ بنا کب تھا

ماں میں آیا تھا

ڈاکٹر تصور اسلم بھٹہ/ آسٹریلیا

تری پیروں کی مٹی کو
آنکھوں سے لگانے کو
میں آیا تھا۔

(یہ میری آنے والی نئی کتاب ''اہل وفا کی بستی'' کا دیباچہ ہے جو میں نے اپنی ماں کے نام کیا ہے۔)

سلانوالی روڈ پر سرگودھا سے کوئی بیس کلومیٹر دور میرا گاؤں ہے

اس گاؤں کے باہر ہماری آبائی زمینوں کے بیچوں بیچ بنے خاندانی قبرستان کے اندر خوبصورت بلند و بالا کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں گھری میرے بزرگوں کی قبریں ہیں میرے پڑدادا حسین بخش بھٹہ ان کے والد امیر بخش بھٹہ میرے دادا حاجی اللہ رکھا بھٹہ، ان کے بھائی حاجی اللہ دتا بھٹہ، میرے والد محمد اسلم بھٹہ پڑدادی اور دادی کی قبریں۔ میرے سارے ہی بزرگ اس ایک جگہ پر ابدی نیند سو رہے ہیں۔

آج چند مہینوں کے وقفے کے بعد میں ایک بار پھر اس قبرستان میں کھڑا ہوں۔ جس میں ایک نئے باسی کا اضافہ ہو گیا ہے۔

میرے سامنے والد محترم کے قدموں کی جانب ٹھنڈی کچی مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس پر گلاب کی نئی پتیاں بکھری ہیں تازہ تازہ پانی کا چھڑکاؤ ہوا ہے۔ مٹی کے اس ڈھیر کے گرد پکی اینٹوں کی حد بندی ہے۔

ٹھنڈی مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے میری وہ ہستی ہمیشہ کے لئے جا سوئی ہے جس کی آغوش کی گرمی اس کی حدت کبھی پتھر کو بھی پگھلا دینے کی شکتی رکھتی تھی۔ جس کے ہاتھوں کا نرم و گداز لمس بڑی سے بڑی سردرد کو دور کر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ جس کی دعائیں ہمیشہ میرے گرد حصار بنائے رکھتی تھیں۔ جس کی ممتا کی گھنی چھاؤں زندگی کی تپتی دھوپ میں ہمیشہ میرے سر پر سایہ فگن رہی لیکن آج میرے سر کی چھاؤں مجھ سے چھن گئی ہے۔ جانے کیوں ٹاہلی کے اس گھنے درخت کے نیچے بھی مجھے اپنے سر پر سورج کی تپش کا احساس ہو رہا ہے جو اس قبر پر سایہ فگن ہے۔

وہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہیں جو کبھی میری راہ تکتی تھی۔ وہ لب آج خاموش تھے جن پر کبھی میرے لئے دعائیں مچلتی تھیں۔

قبر پر پانی کا تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا ہے جس کے نتیجے میں ٹھنڈی مٹی کی یہ ڈھیری بھی مہک اٹھی ہے یوں لگتا ہے جیسے مٹی سے آنے والی اس سوندھی خوشبو میں ماں کی ممتا کی خوشبو بھی شامل ہو گئی ہے جس نے مجھے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

محسوس ہوتا ہے جیسے منوں مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے سے بھی وہ مجھے دیکھ رہی ہیں

اور پوچھ رہی ہیں تم ایک بار پھر دیر سے آئے ہو تم ہمیشہ دیر کر دیتے ہو میں تمہارا انتظار کرتے کرتے چلی گئی۔ میری آنکھیں تمہاری راہ تکتی رہیں لیکن تم نہیں آئے اب آئے ہو تو وہ بھی دیر سے۔ تمہیں کئی بار کہا تھا کہ اتنی دور نہ جایا کرو کہ جب میں آواز دوں تو تم پہنچ ہی نہ سکو

نم آنکھیں، لرزتے ہاتھ، فاتحہ پڑھتے ہونٹ
آنسوؤں سے تر چہرہ،
سود و زیاں کا حساب کتاب کرتا
دل بار بار یہ سوچتا ہے کیا کھویا ہے؟ کیا پایا ہے؟

کچھ ایسی ہی صورت حال سے میں چار سال پہلے گزرا تھا جب یہیں اسی جگہ والد صاحب کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر پہلی بار یہ جمع تفریق کی تھی۔

لیکن اس بار تو میں نے سب کچھ کھو دیا اس دفعہ تو میرا دامن ہی خالی ہو گیا ہے

سوچتا ہوں اب تو کھیڈ ہی مک گئی ہے۔

میں نے اچھا بیٹا ہونے کا کون سا فرض نبھایا ہے۔ وہ جس نے مجھے نو مہینے تک اپنی کوکھ میں رکھا۔ جس کے پھیپھڑوں کے سہارے میں نے زندگی کی پہلی سانس لی۔ جو اپنی خوراک سے کاٹ کر میری بھوک مٹاتی رہی۔ جس کا دودھ خون بن کر آج بھی میری رگوں میں دوڑتا ہے۔ میری ہر ہر سانس جس کی مقروض ہے لیکن میں نے اس کا کون سا قرض ادا کیا ہے نہ آخری وقت میں اس کو الوداع کہا نہ اسکی میت کو سہارا دیا نہ اسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔

میں وہ بدنصیب تھا جس نے پردیس جانے کی بڑی بھاری قیمت چکائی تھی ڈگریوں اور ڈالروں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے میں اتنا دور نکل گیا کہ میرے اپنے کہیں بہت پیچھے رہ گئے۔

پیاری بہن رخصت ہوئی میں نہ پہنچ سکا، والد فوت ہوئے کرونا کی وبا پاؤں کی زنجیر بن گئی اور میں بے بسی سے تین ہفتے تک آسٹریلین گورنمنٹ کے دروازے کھٹکھٹا تا رہا، اب ماں گئی ہے تو ایک بار پھر میں غیر حاضر تھا وہ انتظار کرتے کرتے چلی گئی اس کی آنکھیں دروازے پر جمی رہئیں اس کے کان میرے قدموں کی آہٹ کے منتظر رہے لیکن میں نہیں آیا اور جب پہنچا تو وہ ناراض ہو کر منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔

میں بدبخت نہ اس کے قدموں کو بوسہ دے سکا نہ اس کی میت کو کندھا دے سکا اور نہ اسے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتار سکا۔ پچھتاوے، شرمندگی، حسرت و ملال اور پشیمانی و ندامت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں ایسی اٹھی کہ میرا سر چکرانے لگا ذہن ماؤف ہو گیا، میری ٹانگوں نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، مجھے لگا جیسے میں گر جاؤں گا میں سہارے کے لئے ان کے قدموں کی جانب زمین پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ہی قبر کے دوسری جانب شبینہ بھی زمین پر بیٹھی تھی اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپائے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے شکار تھے اس بدنصیب کو بھی ماں کا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہم

دونوں کو یارا نہ تھا کہ ایک دوسرے کو تسلی دے سکتے ۔ کوئی ہمیں تسلی دینے والا بھی وہاں موجود نہیں تھا۔

رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ میں پہلے ہی کیوں نہ آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ جا رہی ہیں لیکن میں اس فریب میں مبتلا رہا کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس بار بھی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر چلی آئیں گی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے اندر حوصلہ نہیں تھا کہ انہیں اس طرح بستر پر بے سودھ دیکھ پاتا۔ میرے اندر کا بزدل آدمی کیسے ان بند آنکھوں کا سامنا کرتا جو سوتے میں بھی مجھے دیکھ کر جاگ اٹھتی تھیں۔ میری خوشبو سے مجھے پہچان لیتی تھیں۔

میں لندن میں تھا واپس آسٹریلیا جاتے وقت دبئی پہنچا۔ تو ان سے ملنے کو دل چاہا ٹکٹ تبدیل کروائی اور پاکستان چلا آیا۔ رضوان کو کہا کہ انہیں میرے بارے میں نہ بتانا میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ صبح پانچ بجے سرگودھا پہنچا تو وہ جاگ رہی تھیں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بستر پر لیٹی ذکر و اذکار میں مشغول تھیں۔ میں نے نظروں کے سامنے آئے بغیر سر کی جانب سے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہتھیلیوں سے ان کی آنکھیں بند کر دیں اور ماتھے پر بوسہ دیا کیونکہ رضوان جب بھی گھر آتا تو ان کے کمرے میں داخل ہو کر ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا میرا خیال تھا مجھے نہیں پہچان پائیں گی لیکن میرے لمس سے میری خوشبو مجھے فوراً پہچان گئیں۔ کہنے لگیں۔

تصورا ے ! مینوں لگ ریا سی آج توں آویں گا۔

حالانکہ ان کے وہم وگمان میں دور دور تک بھی نہیں تھا کہ میں پاکستان آ رہا ہوں۔

میں تو اتنا کٹھور تھا جو اپنی ساری زندگی ماں سے محبت کرنے کے سلیقے سے بھی نا آشنا رہا۔

ماں کو چومنے کا، اس کے ماتھے کو بوسہ دینے کا، اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگانے کا فن بھی میں نے چھوٹے بھائی سے سیکھا تھا۔

مجھے تو ساری عمر ماں سے محبت کا اظہار کرنا بھی نہ آیا اور جب آیا تو ان کے جانے کا وقت آ چکا تھا۔

میں اس سال دسمبر میں انہیں ملنے پاکستان آیا تو بھابھی نازیہ نے میرے لئے مولی والا پراٹھا بنایا۔ مجھے یہ پراٹھا بڑا مرغوب ہے۔

جب بھی پاکستان جاتا ہوں تو نازیہ بھابھی ناشتہ بنانے سے پہلے مولی کے پراٹھے کا ضرور پوچھتی ہیں اور میں انکار نہیں کر پاتا۔ وہ بھی اچھا پراٹھا بناتی ہیں اور اسی زمیندارانہ پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں جس سے والدہ کا تعلق تھا لیکن بھابھی کے ہاتھ کا بنا پراٹھا کھاتے وقت بھی میری نظریں رہ رہ کر اندر بستر پر لیٹی ماں کے گرد بھٹکتی رہیں اور دل میں ہوک سی اٹھتی رہی کہ کاش یہ پراٹھا ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوتا۔

ماں کے ہاتھ کا بنا مولی والا پراٹھا۔ ممتا کی محبت میں گندھا ہوا ماں کی خوشبو سے مہکتا ہوا بڑا سا جہازی سائز کا مولی والا پراٹھا جس کے درمیان میں مکھن کا ایک بڑا سا ڈلہ رکھا ہوتا۔ میں اس پر آم اور مرچ کے اچار کی پھانکیں رکھتا اور گرم گرم چائے کی سڑکیوں کے ساتھ دو دو پراٹھے کھا جاتا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے بھابھی سے چائے کے دوسرے کپ کی فرمائش کی اور اسے ہاتھ میں پکڑے اندر ماں کے پاس کمرے میں آ گیا اور ان کے بستر کی پائینتی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے مجھے ناشتہ کرتے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنے روبرو پا کر پہلے تو کچھ دیر وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں میرے چہرے کی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی رہیں پھر آہستگی سے بولیں۔

ناشتہ کر لیا ای

مولی والا پراٹھا کھادا سی۔

میں ان کے لہجے کے کرب کو محسوس کر کے دکھی ہو گیا۔

جی مولی والا پراٹھا ای کھادا اے۔

میں نے ان کا کمزور بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے جواب دیا۔

میرا جواب سنکر ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور ایک آنسو دائیں آنکھ سے نکل کر گال پر بہہ نکلا

میں نے تڑپ کر ٹشو پیپر سے ان کا چہرہ اور آنکھیں خشک کیں ان کے ہاتھوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ان کا بایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر بیٹھ گیا۔

وہ رندھی ہوئی آواز میں مجھے کہنے لگیں۔ ویکھ میرے ہتھاں نوں کی ہو گیا اے۔ کنے سُک گئے نیں۔

توں ایڈھا وڈا ڈاکٹر ایں۔ میرا علاج کیوں نہیں کر دا۔ میں کدوں منجی توں اتر کے تے چلنا پھرنا شروع کراں گی۔

میں بے بس کمزور انسان مشیئت ایزدی کی اس ستم ظریفی پر سسک کر رہ گیا

میرے اکاؤنٹ میں پڑے ڈالر میری ڈاکٹری کی تربیت، رائل کالجوں کی ساری فیلوشپس، میری ڈگریاں ماں کا علاج نہیں کر سکتی تھیں۔ کاش میرے اکاؤنٹ میں پڑے لاکھوں ڈالر مجھے میری ماں کے ہاتھ واپس دلا سکتے۔

ان کے الفاظ میرے جگر کو چیر گئے۔ اور میں نے بے بسی سے آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

انہوں نے مجھے ایک بار کہا تھا

کہ کیا تمہیں ڈاکٹر اس لئے بنایا تھا کہ میں جب بھی بیمار ہوتی ہوں تم مجھے کسی دوسرے ڈاکٹر کے حوالے کر دیتے ہو۔ اور یہی مجھ سے ان کی سب سے بڑی شکایت تھی۔

میرے ڈاکٹر بننے پر وہی سب سے زیادہ خوش تھیں۔ اور میں ہی کبھی ان کا خود علاج نہ کر سکا۔

مجھ سے ان کا علاج ہوتا بھی نہیں تھا۔ ان کی بیماری کا سن کر میرے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جیسے زنگ آلود ہو جاتی تھیں میرے ہاتھ پاؤں

پھولنے لگتے تھے۔ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی ہی نہیں جاتی تھی۔

جب بھی ان سے بات ہوتی تو میں پوچھتا کہ آپ کیسی ہیں تو ہنس کر جواب دیتیں۔

میں وی ٹھیک آں تے میری منجی وی ٹھیک اے۔

رضوان تقریباً روز ہی شام کو دن ڈھلے ان کو وہیل چیئر پر بٹھاتا اور باہر مین گیٹ پر لے آتا۔ اور گیٹ کھول دیتا۔ سامنے سڑک کے پار سفید پتھر کے دیواروں والی مسجد بلال ہے۔ جو والد صاحب نے بنوائی تھی۔ ان کے باہر آتے ہی ایک میلہ سا لگ جاتا۔ اہل محلہ ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ ان کے پوتے پوتیاں ان کے اردگرد کھیلنے لگتے۔

سڑک پر آنے جانے والے ان کی خیر خیریت جاننے اور پوچھنے کے لئے رک جاتے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔

وہ ایک ایک شخص کا نام لے کر اس کے اور اس کے اہل خانہ کا حال دریافت کرتیں۔ انہوں نے محلے کی دو نسلوں کو قرآن پڑھایا تھا سارے محلے کے بچے جن کی داڑھیوں میں اب چاندی چمکنے لگی تھی ان کے شاگرد تھے۔ سب ان کو بیرونی گیٹ پر بیٹھا دیکھ کر جمع ہو جاتے۔

یہ میلہ رات گئے لگا رہتا۔ اکثر اسی دوران رضوان مجھے بھی وڈیو کال کرتا۔ اور کہتا

بھائی جان! حج کرلو۔

میں سارا دن اس لمحے کے انتظار میں رہتا تھا جیسے ہی اس کے فون کی گھنٹی بجتی میں جہاں ہوتا جس محفل میں بیٹھا ہوتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوراً اماں کی خدمت میں ان کی زیارت کے لئے حاضر ہو جاتا۔

مجھے فون کی سکرین پر دیکھتے ہی ان کے چہرے پر روشنی سی چھا جاتی۔ مجھے لگتا جیسے لمحوں میں یہ روشنی ہزاروں میل کا سفر طے کر کے چشم زدن میں میرے گرد پھیل گئی ہے۔ اس نے میرے گرد ایک حصار سا بنا لیا ہے۔

پہلے تو میرا تنقیدی جائزہ لیتیں میرے لباس سے اندازہ لگاتیں کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ اگر سلیپنگ سوٹ میں ملبوس ہوتا تو بچوں سے اور بیگم سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرتیں اگر کوئی اچھا لباس پہنا ہوتا تو سمجھ جاتیں کہ میں کسی محفل میں شریک ہوں۔ ان کی ایک نگاہ ایکس ریز کی طرح میرے چہرے سے ہوتی ہوئیں میرے جسم سے گزر جاتی لمحوں میں میرے چہرے سے میرے اندر کا موسم جان لیتیں۔ اور پھر اس دن کی گفتگو کا آغاز اسی موسم کی مناسبت سے ہوتا۔

میرا کلام ہمیشہ اس جملے سے شروع ہوتا۔

امی جی کی حال اے

جواب میں ایک بڑی خوبصورت مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر جاتی۔

میں وی ٹھیک آں تے میری منجی وی ٹھیک اے۔

آخری دنوں میں ان کی سماعت جواب دے گئی تھی۔ کئی آلے لگوائے لیکن سماعت بہتر نہ ہوئی فون پر تو بات بلکل نہیں سن پاتی تھیں۔

میں جو کچھ کہتا تو رضوان وہی ان کے کان کے قریب ہو کر میری بات دہراتا تو ان کو سمجھ آتی۔ دو چار جملے بولنے کے بعد میری قوت گویائی جواب دینے لگتی۔ مجھ سے ان کی بے بسی دیکھی نہ جاتی۔ وہ بھی چند جملوں کے بعد خاموش ہو کر مجھے تکتی رہتیں، دیکھتی رہتیں، میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتی رہتیں اور میں بھی اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انہیں دیکھتا رہتا۔

بے بسی کے آنسو ان کی پلکوں پر بھی چھلکنے لگتے اور ہر بار مسکراہٹوں سے شروع ہونے والا یہ حج بے بسی کے آنسوؤں پر ختم ہوتا اور یہ روز کا معمول تھا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیماری کی شدت بڑھ گئی تھی۔ پھر ایک دن باتھ روم میں پھسل کر گریں تو سر کموڈ کے ساتھ ٹکرایا۔ گردن کے مہروں پر شدید ضرب آئی۔ اور بالکل مفلوج ہو گئیں۔ صرف آنکھوں کی حرکت سے زندگی کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن قوت گویائی محفوظ رہی۔

ڈاکٹر کائنات بڑی قابل فزیو تھراپسٹ ہے اس نے بڑی محنت کی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ پھر وہیل چیئر پر آ گئیں۔ لیکن ہاتھ بالکل کام نہیں کرتے تھے۔ اپنے جسم پر بیٹھی مکھی بھی نہیں اڑا سکتی تھیں نماز روزہ، ذکر اذکار سب چھوٹ گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے جینے کی تمنا ہی ختم ہو گئی ہو۔ سارا دن بستر پر لیٹی چھت کو دیکھتی رہتیں۔ کوئی سوال کرتا تو مختصر سارا جواب دے کر خاموش ہو جاتیں۔

میں ملنے آیا تو ایک دن مجھے کہنے لگیں کہ میں نے بڑے حج کئے ہیں اور بے شمار عمرے بھی لیکن اب آخری بار پھر کے مدینیا نے کو دل چاہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لئے انہیں بوسہ دیا ان کے ماتھے کو چوما اور بے اختیار انہیں کے مدینے لے جانے کا وعدہ کر لیا۔

لیکن جب جذبات کا لمحہ گزر گیا تو خیال آیا کہ اس حالت میں انہیں کیسے اتنی دور لے جایا جا سکتا ہے۔ اس کا ذکر دوست احباب سے کیا، بھائیوں سے پوچھا تو ہر کسی نے بھی یہی کہا

میرا خیال تھا کہ یادداشت کمزور ہے۔ بھول جائیں گی۔ مگر جب بھی سامنا ہوتا بس یہی کہتیں کہ مجھے کے مدینے لے جاؤ۔

لگتا تھا جیسے کے مدینے جانے کا خیال ان کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

ان کا اصرار بڑھا تو آخر کار ہم نے انہیں عمرہ کے لئے لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم چار بھائی رضوان بھٹہ، عاطف بھٹہ، عمران بھٹہ، بہن شبینہ اور اماں اختری جو والدہ کی چوبیس گھنٹے دیکھ بھال کرتی تھی ہم سب اپنے اس انوکھے اور مشکل سفر پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے دواؤں کا ایک بڑا بکس بھرا اور اس میں ایمرجنسی میں استعمال ہونے والی ہر ممکن دوا، مختلف قسم کی ڈرپس Drips، آئی وی کینولا IV

Cannula، کیتھیٹر Catheter جو چیز ذہن میں آئی رکھ لی ۔ پی آئی اے سے خصوصی اجازت لی ۔ پوری سیٹ ان کے لئے بک کروائی۔

چھوٹے بھائی عاطف کی چونکہ ٹریول اور حج عمرہ کی ایجنسی ہے ۔اس نے کام آسان کر دیا۔ ان کی سپشل موٹرازڈ وہیل چیر motorized wheel chair ساتھ لی ۔ ماں کو ہاتھوں میں اٹھایا۔ جہاز میں لٹایا اور مدینہ پہنچ گئے۔

عاطف کی ٹیم مدینہ میں تیار تھی اس نے مسجد نبوی کے صحن کے باہر سڑک کے پار پہلے ہوٹل میں کمرے ہمارے لئے مختص کروائے تھے۔

بس ہم سڑک پار کرتے اور مسجد نبوی پہنچ جاتے۔

مدینہ پہنچتے ہی معجزہ ہوا وہ ٹھیک ہونے لگیں پہلے وہیل چیر پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پاتی تھیں وزن نہیں سہار سکتی تھیں اب دن کا بیشتر حصہ اسی وہیل چیر پر مسجد نبوی میں گزارنے لگیں۔ ان کی پسندیدہ جگہ مسجد نبوی کا صحن تھا۔ رات گئے تک گنبد خضرا کے سامنے بیٹھی سبز گنبد کو تکتی رہتیں ۔شام کا سورج ڈھلنے پر آ قا کے آشیانہ کے صحن میں چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہلکی ہوا ،افق پر پھیلی لالی اور سبز گنبد یہ سب مل کر اتنا شاندار اور دلکش منظر ترتیب دیتے کہ سارے جہان کی خوبصورتی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی اور جی کرتا کہ وقت یہیں رک جائے اور باقی زندگی یوں ہی آ قا کے در پر گزر جائے اور پھر ان سب سے مستزاد ماں کی موجودگی یہ میری زندگی کے قیمتی ترین لمحے تھے۔ میں بھی ماں کے قدموں میں گم سم بیٹھا رہتا۔ اور دوسرے بھائی بہن بھی وہیں موجود رہتے۔

سبز گنبد کو دیکھ کر ان کے چہرے پر اتنی خوبصورت مسکراہٹ آتی کہ لگتا ساری دنیا کھلکھلا اٹھی ہو۔ بس وہیل چیر پر بیٹھی سبز گنبد کو تکتی رہتیں اور مسکراتی رہتیں

ایک دفعہ تو زیر لب کچھ گنگنانے لگیں ۔غور سے سنا تو اپنی پسندیدہ نعت گنگنا رہی تھیں نبی جی نبی جی پیارے نبی جی

ایک دن اتنے خوشگوار موڈ میں تھیں کہ وجد میں آ گئیں اور اپنی سریلی خوبصورت آواز میں بڑی دیر تک گاتی رہیں۔

محمد نہ ہوتے خدائی نہ ہوتی
خدا نے یہ دنیا بنائی نہ ہوتی

لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور محظوظ ہوئے۔

شبینہ پاس بیٹھی تھی ۔اس نے یہ انمٹ اور انمول لمحے اپنے فون میں ہمیشہ کے لئے قید کر لئے۔

ہمارا زیادہ وقت مدینہ میں ہی گزرا اپنے بارہ تیرہ روز کے اس قیام میں مجھے ایک دفعہ بھی اپنا دواؤں والا بکس کھولنے کی ضرورت نہ پڑی ۔ پھر جب ہم عمرہ کر کے واپس لوٹے تو وہ واپسی پر سارا رستہ سیٹ پر خود کسی سہارے کے بغیر بیٹھی رہیں۔

پیشاب کی نالی (Catheter) سے بھی چھٹکارا مل گیا۔

ان کی جیسے کایا پلٹ گئی تھی۔

اب دن کا بیشتر حصہ باوضو رہنے لگیں۔ نماز روزہ ذکر واذکار سب واپس لوٹ آئے، چار پانچ دنوں میں پورا قرآن پڑھ ڈالتیں، لبوں پر ہر وقت درود شریف رہنے لگا۔ آخری اڑھائی سال اسی طرح گزرے۔

ان کا تعلق چشتیاں ر حاصلپور کے ایک متمول زمیندار گھرانے سے تھا۔ ہمارے نانا بڑے دبنگ زمیندار تھے اور علاقے میں ان کا ڈنکا بجتا تھا ۔ دو بیگمات سے ان کی سات بیٹیاں اور دو بیٹے تھے ۔ بیٹیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے انہوں نے گھر پر ہی اہتمام کر رکھا تھا دو خواتین اساتذہ انہیں گھر پر پڑھایا کرتی تھیں۔

وہ بہت پڑھی لکھی تو نہیں تھیں لیکن میاں محمد بخش کی سیف الموک بلھے شاہ اور خواجہ فرید کی شاعری پر انہیں خاصا عبور حاصل تھا۔ خاص طور پر سیف الموک کے بے شمار اشعار انہیں زبانی یاد تھے اور موقعہ کی مناسبت کے اعتبار سے اس خوبصورتی سے پڑھتیں کہ انسان دنگ رہ جاتا۔ رابعہ بصری کے بے شمار واقعات بھی انہیں یاد تھے۔ شائید خاتون ہونے کے ناطے ان کو رابعہ بصری سے خاص لگاؤ تھا۔ میں یروشلم گیا تو جبل زیتون پر حضرت رابعہ بصری کی قبر پر خاص طور پر حاضر ہوا اور انہیں والدہ کا سلام پہنچایا اور جب واپس آ کر میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کی رابعہ بصری سے مل کر آیا ہوں تو بہت خوش ہوئیں ۔اور کہنے لگیں ۔

میرا اسلام دتا سی۔

نانا کی دبنگ شخصیت کا ان کی ساری بیٹیوں میں اور خاص طور پر والدہ پر بڑا گہرا اثر تھا ۔ وہ خواہ سینکڑوں کے مجمع میں ہوتیں ان کی شخصیت کو نظر انداز مشکل ہوتا تھا۔ محلے بھر میں وہ مقناطیس کی سی حثیت رکھتی تھیں اور ان کے کٹڑ بریلوی رجحانات کی وجہ سے ہمارے گھر میں ہر ماہ میلاد اور گیارہویں شریف کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔ اور اپنی سریلی دل سوز آواز میں نعت پڑھا کرتی تھیں ۔ محلے کے پروگرامات کی بھی روح رواں ہوتی تھیں ۔ محلے بھر کی خواتین مشورے اور اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کے گرد جمع رہتیں ۔ کئی غریب گھرانے ان کی مالی امداد سے چلتے تھے۔ صدقہ خیرات اس طرح کرتیں کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے دیتیں ۔یتیم بچیوں کی تعلیم وتربیت اور حفظ قرآن کے لئے باقاعدہ ایک ادارہ بنا رکھا تھا۔

منگل کے دن ان کی بیماری کا سنا اور وہ ہسپتال میں داخل ہوئیں تو ان کے معالج ڈاکٹر عارف ملک سے بات کی ،ڈاکٹر ہاشم عمران کو فون کیا دونوں نے تسلی دی کہ ٹھیک ہو جائیں گی بہتر ہو رہی ہیں ۔ ہاشم کا وجود ان تیس پچیس سالوں میں میرے لئے بوتل والے جن کی حثیت اختیار کر گیا تھا جیسے ہی والدین کے ساتھ گرم وسرد ہوتی میں ہاشم کو فون کر دیتا وہ ڈاکٹر لے کر پہنچ جاتا۔ ان دونوں کی تسلی پر میں نے جمعہ کے لئے ون وے سیٹ بک کروائی ۔ سوچا ایک دو کام ہیں نپٹا کر جاؤں گا اور جب تک وہ واپس آنے کی اجازت نہ دیں گی انہی کے پاس رہوں گا لیکن جمعرات کے دن اچانک ان کی طبیعت اتنی بگڑی کہ چند ہی گھنٹوں میں میرا انتظار کرتے ،اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں ۔ اور میں کٹھور دل بدنصیب ایک

CS CamScanner

بار پھر فاصلوں کے جھنجھٹ میں ایسا پھنسا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہی نہ ہو سکا۔

جمعرات کو کوئی فلائٹ نہ ملی تو مجبوراً جمعہ کے دن ہی پاکستان جانے کے لیے ایئر پورٹ پہنچا اور جب کاؤنٹر پر کھڑی خوش اخلاق خاتون کو پاسپورٹ دیا تو وہ پوچھنے لگی

آپ ڈاکٹر ہیں

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر وہ میرے چہرے پر چھائی ویرانی بے رونقی اور پژمردگی دیکھ کر وہ چونک گئی۔ کہنے لگی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ میں کیا کہتا۔ اپنا درد یوں سر عام بانٹنا مجھے اچھا نہ لگا لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ٹھیک ہوں۔ بس ایمرجنسی میں پاکستان جانا پڑ رہا ہے۔ اس نے کچھ اور تو نہ پوچھا لیکن کہنے لگی کہ

اگر آپ پسند کریں تو میں کچھ اضافی رقم کے بدلے آپ کی سیٹ بزنس کلاس میں اپ گریڈ کر دیتی ہوں۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہاں کہہ دی۔

سارے رستے میں یہی سوچتا رہا کہ یہ آخری بار ہے کہ ماں سے ملنے جا رہا ہوں اب پاکستان جانے کے ہزار اور بہانے ہوں گے لیکن یہ بہانہ نہیں ہوگا کہ ماں سے ملنے جا رہا ہوں۔

ماضی کی ایک کہکشاں تھی جو سارے رستے میرے دل و دماغ کو ماں کی یادوں سے منور کرتی رہی۔ اس کی صورت رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگتیں اس کی مسکراہٹ، اس کی گفتگو، اس کے چہرے کی شفقت مجھے گھیر لیتی، دل و دماغ کا یہ مد و جزر چہرے پر بھی پھیل جاتا۔ میرے پلکیں بار بار بھیگنے لگتیں۔ مجھے جہاز کی رفتار سے گھبراہٹ ہونے لگی، لگتا جہاز بس رینگ رہا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا جیسے رک گیا ہے۔

میرا بزنس کلاس میں اپ گریڈنگ کا فیصلہ میرے لئے وبال جان گیا۔ میں اکانومی میں رہتا تو شائید ایئر ہوسٹس کی نظروں سے بچ بچا کر وِنڈو سیٹ کی طرف دوسرے دو مسافروں کے پیچھے چھپا رہتا لیکن بزنس کلاس میں چھپنا مشکل ہو گیا۔

ایک سانولی سی ایئر ہوسٹس کئی بار کھانا لے کر آئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہتا تھا میرے چہرے پر چھائے خزاں کے رنگ اور آنکھوں کی ویرانی و نمی دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی اور پوچھنے لگی کہ میں ٹھیک تو ہوں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس مجھے بھوک نہیں ہے لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی وہ اپنی انچارج کو لے آئی تو مجبوراً مجھے انہیں بتانا پڑا کہ میں ویسے تو ٹھیک ہوں لیکن میری دنیا اجڑ گئی ہے۔ وہ ہمدرد خاتون والدہ کی وفات کا سن کر دکھی ہو گئی اور مجھے کہنے لگی کہ

میں سمجھ سکتی ہوں آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ چند ماہ پہلے جب میری ماں رخصت ہوئی تھی تو میں امریکہ میں تھی اور میں بھی گھر جاتے ہوئے ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھی۔

میں اتنے اضطراب میں تھا اور ذہنی طور پر اتنا منتشر تھا کہ میں نے اخلاقاً بھی اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے ہے اور اس کی ماں اس سے کیسے رخصت ہوئی تھی۔

ہمارا دکھ سانجھا تھا اور وہ اس دکھ کی زنجیر میں ایسی بندھی کہ چودہ پندرہ گھنٹے کی اس لمبی فلائٹ میں پھر اس نے میرا بڑا خیال رکھا ہر تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہ کچھ لے کر آ جاتی تھی۔ مجھے اس کی ہمدردی سے وحشت ہونے لگی تو پھر میں سارے رستے آنکھیں بند کئے سونے کا بہانہ کرتا رہا لیکن وہ باز نہ آئی بہانے بہانے سے آ جاتی

جہاز باد و باراں میں پھنس کر ہچکولے لینے لگا کئی چیخیں فضا میں گونجیں تو وہ میرے لئے دو آرام دہ تکیے اور کمبل لے کر آ گئی۔ جو میں شکریے کے ساتھ رکھ لئے لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ لگتا تھا جیسے ماں کی طرح نیند بھی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا یہ چودہ گھنٹے جیسے چودہ سال بن گئے تھے۔ آنکھیں کھولتا تو وہ آ موجود ہوتی اور بند کرتا تو ماں اپنی یادوں کے ساتھ آ جاتی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ جب اندر کا موسم ابر آلود ہو تو کیسے ماضی کی کہکشاں سے در آنے والی ہر یاد، ہر سوچ نشتر بن جاتی ہے اور گزرنے والا ہر لمحہ درد۔

لیکن جب درد حد سے گزر جائے تو پھر مرہم بھی بن جاتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ماں کی یہی درد بھری یادیں پیار بھری تھپکیاں بن گئیں۔ میں ماں کی یادوں میں ایسا کھویا کہ مجھے لگا جیسے میں اس کی گود میں سر رکھے سو رہا ہوں اور اس کی نرم گرم انگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں۔

ستر کی دہائی میں والد صاحب کا تبادلہ سعودی عرب ہو گیا۔ جدہ کی جس بڑی بلڈنگ میں ہم رہتے تھے اس میں کئی فلسطینی اور مصری خاندان بھی آباد تھے والدہ کی بہت جلد ان خواتین سے دوستی ہو گئی۔ ساری ہی خواتین ان کی سوجھ بوجھ حکمت اور سگھڑ پن سے متاثر تھیں انہوں نے چند ہی مہینوں میں گزارے لائق عربی بھی سیکھ لی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بہتر ہوتی چلی گئی۔ مرد حضرات اپنے دفاتر کو چلے جاتے تو بلڈنگ کی یہ خواتین گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ہمارے گھر میں اکٹھی ہو جاتیں۔ اور شام گئے تک محفل جمی رہتی۔ انہی دنوں لیلیٰ خالد نے ایک اسرائیلی طیارہ اغواہ کیا تو وہ جیسے سارے محلے کی عورتوں کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ عورت ہونے کے ناطے سے وہ تمام خواتین کی ہیرو تھی ہر وقت اسی کی بہادری کے چرچے ہوتے۔ انہی دنوں والدہ کی تحریک فلسطین سے وابستگی اتنی بڑھی کہ جب ہمارا تیسرا بھائی پیدا ہوا تو انہوں نے اسے یاسر عرفات کا نام دیا۔

ایک فلسطینی خاتون

حکمت سے تو ان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ وہ اکثر اس کی کہانیاں ہمیں بعد میں بھی عربی اور پنجابی میں بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں اس کی ایک

بیٹی میری ہم عمر تھی جس کے بارے میں حکمت کہا کرتی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی الیاس (بڑے بھائی) سے کرے گی تصور سے نہیں کیوں کہ وہ بہت شرارتی ہے اور ہر وقت میرے گھر کی بیل بجا کا بھاگ جاتا ہے۔

میں فلسطین گیا تو روز شام کو انہیں مسجد اقصیٰ کی لائیو وڈیو دکھاتا تو وہ بہت خوش ہوتیں۔

ایئر ہوسٹس میرے انکار کے باوجود میرے سامنے کھانا رکھ گئی تھی۔ چاول دیکھ کر مجھے ماں کے ہاتھوں کا بنا زردہ یاد آ گیا۔

خاص طور پر جب بھی مدرز ڈے آتا تو ماں کے ہاتھوں کا بنا زردہ یاد آتا ۔ میری بیگم کو بھی میری اس کمزوری کا پتہ تھا۔

شاید اسی لئے اس سال مدر ڈے آیا تو بیگم نے پھر زردہ بنایا۔

وہ اچھا زردہ بناتی ہے جب ہماری شادی ہوئی تو اسے زردہ بنانا نہیں آتا تھا لیکن چونکہ مجھے زردہ بہت پسند ہے اس لئے اس نے میری فرمائش پر کوشش کر کے زردہ بنانا سیکھ ہی لیا۔

اور مہینے میں ایک آدھ بار ضرور بناتی ہے۔

لیکن اس کے بنائے زردے میں ایک چیز کی ہمیشہ کمی رہی وہ ماں کی ممتا کی مٹھاس کی ہے۔

اور ماں کے ہاتھ کا بنا زردہ تو دنیا کا بہترین زردہ ہوتا تھا

میں ہاسٹل میں رہتا تھا جب بھی گھر میں زردہ بنتا میرا حصہ ایک ڈبے میں ڈال کر فرج میں محفوظ کر لیتیں اور جب گھر واپس آتا تو کبھی کبھی چار پانچ ڈبے زردے کے میرے منتظر ہوتے اور میری عید ہو جاتی۔

پچھلے دنوں سلمان باسط صاحب کی ایک پوسٹ پڑھی انہیں بھی زردہ بہت پسند ہے وہ بھی اپنی ماں کے ہاتھوں سے بنا زردہ بہت یاد کرتے ہیں جو انہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکی ہیں۔

میں نے ان کی پوسٹ پر تبصرہ کیا تو کہنے لگے کہ آپ کا تبصرہ پڑھ کر میں مزید دکھی ہو گیا ہوں۔

لیکن باسط صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ماں کے ہاتھ کا بنا زردہ یاد تو دلایا کیونکہ مائیں بھی تو سانجھی ہوتی ہیں اور ان کے ہاتھوں کی مٹھاس بھی سانجھی۔

بیگم تو تیار ہو کر مدر ڈے کی تقریب میں شرکت کے لئے چلی گئی۔ جس کا اہتمام ماریہ بھابی نے آسٹریلین پاکستانی وومن ایسوی ایشن (اپوا) کے تعاون سے کیا تھا لیکن میں اس کے بنائے زردے کی پلیٹ سامنے رکھے ماں کا بنایا زردہ یاد کرتا رہا۔

مجھے شکیل عادل زادہ کی بازی گر کا بابر زمان خان یاد آتا رہا جو کورا کی محبت میں ساری دنیا تیاگ آیا تھا۔ ہر چیز بھلا کر اس کی تلاش میں سارا ہندوستان گھومتا رہا لیکن جب کبھی اسے کورا کی یاد سے فرصت ملتی تو اسے ماں کے ہاتھ کا بنا زردہ یاد آ جاتا۔ ماں کی محبت کی وہ مٹھاس یاد کرنے لگتا جو خشکے میں بھی مٹھاس ڈال کر اسے زردے میں بدل دیتی تھی۔

اس دن اتوار تھا چھٹی کا دن تھا ناشتہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کے بنے مولی والے پراٹھے کھانے کو جی چاہتا رہا۔ آنسوؤں کی جھڑی کے دوران یہ تحریر لکھتے ہوئے بھی ماں کی بہت یاد آ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ کا بنا زردہ یاد آ رہا ہے اس کے ہاتھوں کے بنے پراٹھے یاد آ رہے ہیں، اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔

اس کے ہاتھ کا بنا زردہ دیکھے ہوئے اور اس کے ہاتھ کے بنے پراٹھے کھائے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے لیکن مجھے یہ بھی پتہ ہے اب یہ دوبارہ کھانے کو ملیں گے بھی نہیں کیونکہ پہلے تو وہ بہت بیمار تھیں اور صاحب فراش تھیں اور اب ہمیشہ کے لئے اپنے دائمی سفر ہو چکیں ہیں اور یہی قانون فطرت ہے جس سے مفر نہیں۔

لیکن پھر بھی جانے کیوں بار بار ایک ہی دعا دل سے نکلتی ہے

دل نہیں لگدا گدرے رتا
سکھ دی تھوڑی تھاں ہی دے دے
گلاں کر کے موڑ دیاں گاں
تھوڑی دیر لئی ماں ہی دے دے

جیسے جیسے میں بوڑھا ہو رہا تھا مجھے لگتا تھا جیسے ماں کے ساتھ میری انسیت اور لگاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے یہ رفاقت مجھے دنیا کے ہر رشتے پر بھاری محسوس ہونے لگی تھی میرے پاکستان کے چکر بڑھ گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ

انسان کا پہلا عشق ماں ہوتی ہے اور آخری عشق بھی۔

اس سال میں پانچ بار پاکستان گیا۔ جہاں بھی ہوتا تھا واپسی پر ایک دو رات کے لئے ماں سے ملنے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ پہلے تو دیکھ کر بہت خوش ہوتیں لیکن جب واپسی کے لئے تیار دیکھتیں تو دکھی ہو جاتیں اور شکایت بھرے لہجے میں کہتیں کہ

تیرے کول میری واسطے صرف دو راتاں ہی سن۔

اور میں انہیں دوبارہ جلد ملنے کا وعدہ کر کے دکھی دل کے ساتھ واپس اپنی دنیا میں لوٹ آتا۔

مجھے اسی سالہ کارلو بھی بڑی شدت سے یاد آیا۔

بائیس سال پہلے جب میں نیا نیا آسٹریلیا آیا تو ٹاؤن ویلز Townsville ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ ایک دن میں آن کال تھا تو مجھے اپنے رجسٹرار کا فون موصول ہوا کہ ایک فیملی نے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں غدر مچا رکھا ہے اور وہ سرجن کو بلانے کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ ان کی ماں کا آپریشن کیا جا سکے۔ انہوں نے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ کا سارا ماحول گڑبڑ کر دیا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے میں مریض دیکھنے ہسپتال گیا تو دیکھا کہ چار پانچ بہن بھائیوں پر مشتمل ایک اٹیلین Italian خاندان ہے جو اپنی بوڑھی ماں کے بستر کے گرد بے تابی سے جمع تھا۔

اس خاتون کی عمر سو سال سے تجاوز کر رہی تھی وہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا تھی جو بری طرح اس کے سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ اس کا مرض لاعلاج تھا۔

CS CamScanner

کینسر کی آخری سٹیج تھی ۔ مجھے سارے خاندان سے بات کرنے میں مشکل پیش آئی تو میں نے سب سے بڑے بیٹے کو دفتر میں بلایا جو خود بھی اسی پچاسی کے پیٹے میں تھا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

دیکھو کارلو ! تمہاری ماں نے زندگی کی بڑی شاندار اننگز کھیلی ہے۔ وہ آرمی میں بریگیڈیئر تھی اس نے دوسری جنگ عظیم میں اپنی کارگردگی پر کئی تمغے حاصل کئے وہ ایک ہیرو کی طرح زندہ رہی اس نے تم جیسی فرمانبردار اور قابل اولاد پیدا کی ۔ اسے پڑھا لکھایا۔ بڑا کیا۔ لیکن اب اس کے جانے کا وقت آ گیا ہے تو اسے سکون سے جانے دو ۔ کیوں اسے آخری وقت میں اذیت دیتے ہو۔

میری بات سنکر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

ڈاکٹر میں اسے کیسے جانے دوں ۔ میری عمر اسی سال سے اوپر ہے اور آج بھی جب میں رات کو گھر واپس آتا ہوں تو وہ میرے انتظار میں جاگ رہی ہوتی ہے ۔ پہلے جب وہ صحت مند تھی تو خود میرے لئے دروازہ کھولتی تھی میرے لئے کھانا گرم کرتی تھی لیکن اب کئی سالوں سے وہ صاحب فراش تھی بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن میرے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ اولاد کے لئے ماں کیا ہوتی ہے۔

اس دن مجھے لگا کہ

واقعی انسان کا پہلا عشق بھی ماں ہوتی ہے اور آخری عشق بھی ماں ہی ہوتی ہے۔

کارلو یاد آیا تو میری آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

خدا خدا کر کے جہاز قطر پہنچا اور جب میں جہاز سے اترنے کے لئے گیٹ پر آیا تو وہ دروازے پر کھڑی تھی اس نے دکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ رخصتی کلمات ادا کئے اور مجھے ایک ڈبا تھماتے ہوئے ایک بار پھر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ اس ڈبے میں جوس، پانی اور کچھ سنیکس ہیں ۔ میں اس کی اس ہمدردی پر اپنی آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے جلدی سے جہاز سے باہر نکل آیا اور اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔

سوچوں خیالوں کے اسی گہرے سمندر میں ڈوبا میں پاکستان پہنچا تو ماں کے آخری سفر کی باز گشت فضا میں گونج رہی تھی ۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کا جنازہ اس علاقے کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ وہ صرف میری ماں نہیں تھی سارے علاقے کی ماں تھی ۔ محلے کی ان دو نسلوں کی ماں تھی جنہیں اس نے قرآن پڑھایا تھا۔ سارا شہر اس کے جنازے میں شریک تھا لیکن میں اور شبینہ دونوں بہن بھائی وہ بدنصیب تھے جو اس کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔

گھر سے گاؤں تک اور گاؤں سے قبرستان تک کا سفر بھی اتنا ہی طویل ہو گیا تھا جتنا آسٹریلیا سے پاکستان تک کا

قبرستان پہنچ تو گیا لیکن پھر دل گرفتہ سا پلکوں میں آنسوؤں کی لڑی سجائے میں ماں کی پائینتی پر کھڑا رہا۔ ساری دعائیں گڈ مڈ ہو گئی تھیں مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کی مغفرت کے لئے کیا پڑھوں ۔ میں نم آنکھوں کے ساتھ ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو میں نے کئی بار زیر لب اور پھر با آواز بلند کہا

ماں میں آ گیا ہوں ۔ ماں مجھے معاف کر دو۔

ماں مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ ماں مجھے دعا دو۔

فاتحہ پڑھنے کے لئے آنے والے ایک بزرگ نے بڑی انوکھی بات کہی تھی کہ ماں زندہ ہو تو دعا دیتی ہے اور مر جائے تو دعا لینی پڑتی ہے۔ وہ زندہ ہو تو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ہر حال میں دعا دیتی ہے اور مر جائے تو دعا لینے اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔

میں بھی پشیمان نادم اور شرمندہ اسی یقین کے ساتھ ماں کے قدموں میں کھڑا رہا کہ وہ میری دیر سے آنے کی لغزش اسی طرح معاف کر دے گی جیسے ساری عمر میری کوتاہیاں میری غلطیاں معاف کرتی رہی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ آج بھی درگزر کر دے گی۔ اس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح آج بھی دعا کے لئے اٹھیں گے ۔ دیر ہو گئی ۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن میں کھڑا رہا۔

پھر مجھے ایک ٹھنڈک کا سا احساس ہوا جو ایک لہر بن کر میرے رگ و پے میں اترتا چلا گیا مجھے اپنے ماتھے پر اپنی گال پر ماں کے ہونٹوں کی حدت محسوس ہوئی۔ ماں کی دعا آ گئی تھی۔ اس نے مجھے معاف کر دیا تھا۔

قبرستان سے واپس آتے وقت میں نے ماں سے عہد کیا

ماں ! میں آیا تھا۔

ماں ! میں پھر آؤں گا۔

بار بار آؤں گا ۔ تیری دعاؤں کے حصول کے لئے ، تیرے پیروں کو بوسہ دینے ، تیرے پیروں کی اس مٹی کو آنکھوں سے لگانے کے لئے جب تک میرے سانس میں سانس ہے میں آؤں گا۔

آج جب میری دوسری کتاب شائع ہونے جا رہی ہے تو میں اپنی اس کتاب کا ایک ایک لفظ اپنی ماں کے نام کرتا ہوں جسے فلسطین سے ، لیلیٰ خالد سے بہت محبت تھی اس نے اپنے ایک بیٹے کو یاسر عرفات کا نام دیا تھا۔

میں یہ سطور اس یقین کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میری ماں اس کتاب کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہے گی ۔ جس طرح اس کی دعا ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔

سائنس اور شاعری کی خوبصورت ملاقات

عرفان جاوید/ لاہور

آئن سٹائن نے مسکراتے ہوئے پوچھا اگر کوئی میز کو نہیں دیکھ رہا، تو کیا وہ پھر بھی موجود ہے؟

ٹیگور ہولے سے ہنسے اور بولے اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہاں میز ہے؟

میں نے یہ حقیقی مکالمہ ایک انگریزی ویب سائٹ پر پڑھا۔ نکتہ خیز اور فکر افروز لگا۔ بعد ازاں اس کا پس منظر جاننے کے لیے کچھ چھان پھٹک کی تو جو سامنے آیا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

جولائی 1930ء کا دن تھا۔ برلن کے نواحی گاؤں کاپوتھ میں یگانہ روزگار مفکر و سائنس دان البرٹ آئن سٹائن کے سادہ سے گھر کا دروازہ کھلتا ہے اور سامنے بھارت کے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کھڑے ہیں۔ ایک طرف وہ شخصیت ہے جس نے زمان و مکاں کے قوانین بدل ڈالے اور دوسری طرف وہ جس نے انسانی شعور اور الوہیت کے باہمی رشتے کو نئی معنویت عطا کی۔ دونوں نوبیل انعام یافتہ، دونوں اپنے اپنے میدان کے باکمال لوگ، مگر دونوں فکر کی دو مختلف سطحوں پر۔ آئن سٹائن، پچاس برس کے، ریاضی اور تجربے سے سچائی تلاش کرنے والے سائنس دان جو سمجھتے ہیں کہ کائنات انسان سے بے نیاز ہے۔ ٹیگور، ان سے بیس برس بڑے شاعر، مفکر، صوفی، جو اس فکر پر قائم ہیں کہ حقیقت شعور کے بغیر ادھوری ہے۔ آئن سٹائن کا یقین ہے کہ اگر آئندہ کا انسان ختم بھی ہو جائے تو ستارے تب بھی روشن رہیں گے، زمین پھر بھی گردش کرتی رہے گی، کششِ ثقل اپنی جگہ قائم رہے گی۔ ٹیگور پوچھتے ہیں لیکن آپ کو اس بات کا کیسے علم ہے؟ آپ کا علم، آپ کی ریاضی، آپ کا مشاہدہ یہ سب انسانی ذہن کے وسیلے سے گزر کر آپ تک پہنچتا ہے۔ آپ کسی ایسی حقیقت کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں جو کسی شعور کے بغیر بھی موجود ہو؟

دو دوستوں کے بیچ مکالمہ ہوتا ہے۔ آئن سٹائن کہتے ہیں کائنات کے بارے میں دو نظریات ہیں ایک یہ کہ اس کا وجود انسان کے مرہون منت ہے، دوسرا یہ کہ یہ انسان سے آزاد ایک خود مختار وجود رکھتی ہے۔ ٹیگور نرمی سے جواب دیتے ہیں جب انسان اور کائنات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو ہم اسے سچائی کے طور پر جانتے ہیں، اور اسی ہم آہنگی کو حسن کے طور پر دیکھتے ہیں۔ آئن سٹائن سوال کرتے ہیں تو کیا سچائی اور حسن دونوں انسان پر منحصر ہیں؟ ٹیگور بلا تامل جواب دیتے ہیں جی ہاں۔ آئن سٹائن چونک جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر انسان نہ رہیں تو کیا یونانی مجسمہ اپالو بیلویڈیر پھر بھی خوبصورت کہلائے گا؟ ٹیگور جواب دیتے ہیں، نہیں، حسن دیکھنے والے کے بغیر وجود نہیں رکھتا۔ آئن سٹائن کہتے ہیں، حسن کے بارے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں، مگر سچ کے بارے میں نہیں۔ ان کے نزدیک ریاضیاتی حقیقت اور طبعی قوانین ازل سے موجود ہیں اور انسانوں کے بعد بھی رہیں گے۔ ٹیگور کہتے ہیں، سچ بھی انسانی ہے، کیونکہ سچ وہی ہے جسے ہم جان سکیں اور پرکھ سکیں۔ اگر کوئی چیز ہمیشہ انسانی فہم سے باہر رہے تو اسے سچ کہنا بے معنی ہے۔ سچ کے لیے شعور ضروری ہے۔ بغیر شعور کے محض ذرات اور توانائی رہ جاتی ہے، سچ نہیں۔

آئن سٹائن بات بدلنے کے لیے میز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ فرض کریں یہاں ایک میز ہے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں تو بھی وہ میز اپنی جگہ موجود رہے گی۔ ٹیگور مسکرا کر کہتے ہیں وہ میز جسے آپ دیکھ رہے ہیں، وہ آپ کے شعور سے پہچانی جاتی ہے۔ جب آپ اسے نہیں دیکھیں گے تو وہ میز نہیں رہے گی، محض مادے کی ساخت باقی رہ جائے گی۔ میز کی ساخت تو آپ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ آئن سٹائن کہتے ہیں اگر اس گھر میں کوئی نہ ہو تو میز پھر بھی موجود رہے گی۔ پھر لمحہ بھر کو رکتے ہیں اور خود ہی اعتراف کرتے ہیں مگر اگر کوئی نہ ہو تو یہ کہنا بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ٹیگور مسکرا کر کہتے ہیں بالکل! اور یہی لمحہ اس مکالمے کا خلاصہ بن جاتا ہے۔

یہ بحث وہاں ختم نہیں ہوئی۔ دونوں کے مابین بے پناہ احترام تھا۔ ٹیگور کئی بار آئن سٹائن سے ملے۔ خط و کتابت جاری رہی۔ کبھی سائنس، کبھی فلسفہ، کبھی شاعری کے پردے میں وہی سوال گونجتا رہا کیا حقیقت شعور سے آزاد ہے یا اسی سے جنم لیتی ہے؟ آئن سٹائن کہتے تھے، ٹیگور سے گفتگو ہمیشہ ذہن کو روشن کر دیتی ہے۔ ٹیگور لکھتے ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ایک مغرب کی منطق اور سائنس کا نمائندہ تھا، دوسرا مشرق کی روحانیت اور وجدان کا۔ دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو سکے، مگر دونوں نے انسانیت کو سوچنے کا ایک نیا زاویہ دیا۔

وقت گزرتا گیا، مگر سوال باقی رہا۔ کوانٹم طبیعیات نے خود آئن سٹائن کے یقین کو چیلنج کر دیا۔ مشاہدے کے اثر، موجی فنکشن کے زوال اور ذرات کے باہمی الجھاؤ نے یہ دکھایا کہ دیکھنے والا خود حقیقت کو بدل دیتا ہے۔ آئن سٹائن نے کہا تھا، خدا کائنات کے ساتھ پانسہ نہیں کھیلتا۔ مگر نئی سائنس نے ثابت کیا کہ شاید کھیل چل رہا ہے۔ اس کے باوجود آئن سٹائن کا یقین کہ ایک عینی، مشاہدے سے آزاد کائنات موجود ہے، آج بھی سائنس کی بنیاد ہے۔ ہم خلائی جہاز مریخ بھیجتے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ مریخ وہاں ہے چاہے ہم دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ دوسری طرف ٹیگور کا فکر

بھی بہر حال زندہ ہے، غیر مادی فلسفیانہ تفکر، شعور کے مطالعے اور قدیم مشرقی دانش کی صورت۔

ان دونوں کے درمیان اصل اختلاف یہ تھا کہ آئن سٹائن حقیقت کو ذہن سے باہر تلاش کرتے تھے اور ٹیگور حقیقت کو ذہن کے اندر۔ آئن سٹائن کہتے ریاضی ازل سے درست ہے۔ ٹیگور جواب دیتے مگر ریاضی تو ذہن کی تخلیق ہے۔ سوچنے والا نہ ہو تو درست کا مفہوم کہاں سے آئے گا؟ ایک کہتا تھا، کائنات آپ کے بغیر بھی ہے۔ دوسرا پوچھتا تھا، اگر آپ نہ ہوں تو آپ کو کیسے معلوم ہو کہ وہ ہے؟ کوئی قائل نہ ہوا مگر سوال زندہ رہا اور شاید ہمیشہ زندہ رہے گا۔

14 جولائی 1930ء کو ایک سائنس دان جس نے زمان و مکان کے تصور کو بدل ڈالا، ایک شاعر سے ملا -ایک ملاقات جس سے دونوں متاثر ہوئے۔ دونوں نے دوستانہ مکالمہ کیا، متاثر ہوئے، مگر قائل نہ ہوئے۔ مگر دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی نے اس سوال کو دوام بخش دیا۔ آج قریباً ایک صدی بعد بھی یہ بحث فلسفے کی نشستوں، سائنس کی لیبارٹریوں اور طالب علموں کے مباحثوں میں گونجتی ہے۔ کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے، وہ صرف نئے سوال پیدا کرتے ہیں۔ آئن سٹائن اور ٹیگور نے ہمیں ایسا ہی ایک سوال دیا اگر کوئی نہ دیکھے، تو کیا حقیقت پھر بھی موجود ہے؟

سوچیے، اور جیسے ہی آپ سوچنا شروع کریں، یاد رکھیں کہ یہ شعور ہی ہے جو سوچ رہا ہے یہی ٹیگور کا نکتہ ہے۔ اور جس چیز پر آپ غور کر رہے ہیں، وہ آپ کی سوچ سے آزاد ہے یہی آئن سٹائن کا نکتہ تھا۔ یہ گفتگو 1930ء میں شروع ہوئی تھی۔ شاید کبھی نہ ختم ہونے کے لیے۔

ڈاکٹر شمیم آزر/امریکا

عمر بھر ختم ہو نہیں پائی
خود سے جاری محاذ آرائی

اک طرف بے اصولی دُنیا
اک طرف دل کی نکتہ آرائی

اجنبیت کچھ اور بڑھتی گئی
زندگی جس قدر قریب آئی

سہل تھا ورنہ یوں تو جی لینا
خود ہمیں کو یہ خُو نہ راس آئی

حوصلوں کو چٹان کرتی گئی
زندگی بھر کی آبلہ پائی

کہیں یادوں کی خشک شاخوں پر
اب بھی کچھ ڈھونڈتی ہے تنہائی

درِ قاتل پہ حرفِ حق کے لیے
کس نے کتنی سہی ہے رُسوائی

فرق یہ ہے کہ جان دی ہم نے
آپ نے جان کی اماں پائی

بڑھ گیا اور حبسِ جاں آزرؔ
جب بھی زنجیر خود کو پہنائی

✦✦✦

ڈاکٹر شمیم آزر/امریکا

بہت سے فیصلے ہم نے کیے ہیں
بہت سے فیصلے خود ہو گئے ہیں

مری آنکھوں کو پڑھنا جان جاؤ
بہت سے دکھ ابھی تک ان کہے ہیں

بہت سی قربتوں کے درمیاں ہی
کسے سمجھائیں کتنے فاصلے ہیں

اب آنکھیں نیند سے دُکھنے لگی ہیں
بہت مدت کے ہم جاگے ہوئے ہیں

تمہارے آنے والے دن کی قسمت
ہم اپنے خون سے لکھتے رہے ہیں

بس اپنے آپ سے ہے اجنبیت
وہی گلیاں وہی سب راستے ہیں

بہ ایں طوفانِ غم خیمے انا کے
غنیمت ہے کہ ہم تھامے ہوئے ہیں

سمٹتی جا رہی ہے ساعتِ عمر
اور اب تک کام سب پھیلے ہوئے ہیں

✦✦✦

CS CamScanner

قیامت کے شاعر کی باتیں!

عارف انیس/ برطانیہ

دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی شام، سٹاک ہوم کا وہ ہال جہاں دنیا کے ذہین ترین دماغ جمع تھے، وہاں سٹیج پر ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو لگتا ہی نہیں تھا کہ اس صدی کا باشندہ ہے۔ لاسلو کراسنا ہورکا ہنگری کا وہ درویش صفت لکھاری جسے دنیا "قیامت کا شاعر" (The Prophet of Apocalypse) کہتی ہے جب نوبل انعام وصول کرنے آیا تو اس کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ نہیں، بلکہ وہی قدیم اداسی تھی جو اس کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ اس نے اپنے خطبے کا آغاز کسی روایتی شکریے سے نہیں کیا، بلکہ ایک ایسے جملے سے کیا جس نے پورے ہال پر سناٹا طاری کر دیا" : ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں امید سب سے خطرناک دھوکہ ہے، اور مایوسی واحد حقیقت جو ہمیں آزاد کرتی ہے۔"

لاسلو کی کہانی بھی ان کے ناولوں کی طرح عجیب اور پیچیدہ ہے۔ 1954 میں ہنگری کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہونے والے اس شخص نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایسے گزارا جیسے وہ کسی اور زمانے کا قیدی ہو۔ وہ کوئی عام مصنف نہیں ہے جو کافی شاپس میں بیٹھ کر لیپ ٹاپ پر ٹائپ کرے۔ لاسلو ایک جدید دور کا "ملنگ " ہے۔ وہ سالوں تک چین، منگولیا اور جاپان کے دور دراز مندروں اور خانقاہوں میں بھٹکتا رہا، صرف اس "خاموشی " کی تلاش میں جو مغرب کے شور میں کھو چکی تھی۔

اس کی زندگی کا ایک حیران کن پہلو یہ ہے کہ اس نے 1985 میں اپنا شاہکار ناول "سیٹن ٹینگو " (Satantango) لکھا، اور پھر مشہور فلم ساز بیلا تار کے ساتھ مل کر اس پر ساڑھے سات گھنٹے کی بلیک اینڈ وائٹ فلم بنا دیا یک ایسی فلم جس میں لوگ صرف بارش کو گرتے ہوئے یا گائے کے ریوڑ کو چلتے ہوئے گھنٹوں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ اس کا دنیا کو چیلنج تھا: " کیا تم میں زندگی کو ٹھہر کر دیکھنے کا حوصلہ ہے؟"

اپنے نوبل لیکچر میں لاسلو نے اسی "ٹھہر جانے" (Stillness) کے فلسفے کو بیان کیا۔ اس نے کہا کہ آج کا انسان "معلومات کے سیلاب میں ڈوب رہا ہے، مگر "دانائی " کے قحط کا شکار ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے زبان کو ابلاغ کا ذریعہ نہیں، بلکہ شور مچانے کا آلہ بنا لیا ہے۔ لاسلو کی تحریر کی سب سے بڑی اور غیر معمولی نشانی اس کے "طویل ترین جملے " ہیں۔ اس کا ایک جملہ کئی کئی صفحات پر محیط ہوتا ہے، جس میں کوما (Comma) تو ہوتے ہیں مگر فل اسٹاپ (Full Stop) نہیں ہوتا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ اتنے لمبے جملے کیوں لکھتے ہیں، تو انہوں نے نوبل کے سٹیج سے جواب دیا" : کیونکہ حقیقت ٹکڑوں میں نہیں ہوتی، حقیقت ایک مسلسل بہاؤ ہے۔ کیا آپ اپنی سانس کو کاٹ سکتے ہیں؟ کیا آپ وقت کو روک سکتے ہیں؟ تو پھر جملے کو کیوں روکتے ہو؟ "ان کا جملہ پڑھنا ایک مراقبے کی طرح ہے، جو قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی تیز رفتار زندگی کو بریک لگائے اور لفظوں کے سمندر میں غوطہ لگائے۔

لاسلو نے اپنے خطاب میں ایک اور انتہائی باریک نقطہ اٹھایا جسے "خوبصورتی کا زوال " کہا جا سکتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کائنات آہستہ آہستہ تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے، اور یہی اس کی خوبصورتی ہے۔ جیسے ایک پرانی عمارت جب گر رہی ہوتی ہے تو اس کے کھنڈرات میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی انسانیت اپنی ناکامیوں میں بھی حسین ہے۔ انہوں نے مغرب کے "پرفیکشن " کے جنون کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی ٹوٹی ہوئی ذات، اپنی ادھوری خواہشات اور اپنی ناگزیر موت کو گلے لگانا چاہیے۔ ان کے مطابق، جو شخص یہ جان لیتا ہے کہ آخر میں سب کچھ مٹی ہونا ہے، وہی شخص اصل میں زندگی کے ہر لمحے کی قدر کر سکتا ہے۔ یہ مایوسی نہیں، بلکہ یہ وہ "آگاہی " ہے جو انسان کو خوف سے آزاد کر دیتی ہے۔

لاسلو کی زندگی کا ایک اور دلچسپ پہلو ان کا ٹیکنالوجی سے فرار ہے۔ وہ آج بھی کاغذ اور قلم سے لکھتے ہیں اور انٹرنیٹ کی دنیا سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیکچر میں خبردار کیا کہ ہم "ڈیجیٹل الزائمر " کا شکار ہو رہے ہیں، جہاں ہم نے یاد رکھنے کا کام مشینوں کو سونپ دیا ہے۔ انہوں نے سامعین کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا" : تمہاری توجہ (Attention) وہ آخری چیز ہے جو تمہارے پاس بچی ہے، اسے سستی تفریح کے بدلے مت بیچو۔ "ان کا یہ جملہ دراصل اس پوری "توجہ کی معیشت " (Attention Economy) پر ایک کاری ضرب تھا جس کا ہم سب حصہ بن چکے ہیں۔

آخر میں، لاسلو کراسنا ہورکائی کا نوبل انعام جیتنا صرف ایک ادیب کی کامیابی نہیں، بلکہ یہ اس "صبر " کی فتح ہے جو آج کل ناپید ہو چکا ہے۔ اس شخص نے ہمیں سکھایا ہے کہ اگر آپ کے پاس کہنے کے لیے کچھ

گہرا ہے، تو آپ کو شور مچانے کی ضرورت نہیں، دنیا خود خاموش ہو کر آپ کو سنے گی۔ ان کا فلسفہ سادہ مگر لرزہ خیز ہے :اندھیرا بہت گہرا ہے، لیکن اگر آپ آنکھیں بند کرنے کے بجائے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی مشق کریں، تو آپ کو وہ روشنی نظر آ جائے گی جو اجالوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ لاسلو نے سٹیج چھوڑنے سے پہلے آخری بات یہ کہی کہ "ادب کا کام تمہیں خوش کرنا نہیں، بلکہ تمہیں جگانا ہے چاہے وہ جاگنا کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔"

خاموشی کا شور اور زوال کی خوبصورتی

(KrasznahorkaiLszl

لاسلو کراسناہورکائی کا خطبہ

آج ہم اس ہال میں روشنیوں کے بیچ کھڑے ہیں، لیکن میں یہاں آپ کو روشنی دکھانے نہیں، بلکہ اس "اندھیرے " کا تعارف کروانے آیا ہوں جسے آپ اپنی آنکھیں بند کر کے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ انعام اس لیے دیا گیا ہے کہ میں نے امید کے جھوٹے گیت نہیں گائے، بلکہ اس مایوسی کو زبان دی ہے جو ہماری روح کے تہہ خانوں میں سسک رہی ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں "امید "سب سے بڑا دھوکہ ہے اور "زوالDecay) ") واحد سچائی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ٹیکنالوجی، ہماری مشینیں اور ہماری ایجادات ہمیں بچا لیں گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی گاڑی میں سوار ہیں جس کے بریک فیل ہو چکے ہیں اور ہم اسے "سفر" کا نام دے رہے ہیں۔

میری تمام زندگی اور میری تمام تحریریں ایک ہی جستجو کے گرد گھومتی ہیں" :وقت کی قید سے آزادی۔" آپ پوچھتے ہیں کہ میرے جملے اتنے طویل کیوں ہوتے ہیں؟ میرے پیراگراف ختم کیوں نہیں ہوتے؟ کیونکہ حقیقت کبھی رکتی نہیں، حقیقت میں "فل اسٹاپ " نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنی زندگی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے ٹویٹس، ہیڈ لائنز، اور مختصر پیغامات۔ ہم نے "توجہAttention) ") کا قتل کر دیا ہے۔ جب آپ ایک جملے کو سانس لیے بغیر پڑھتے ہیں، تو آپ دراصل وقت کے بہاؤ کے خلاف مزاحمت کر رہے ہوتے ہیں۔ میرا ادب آپ کو تفریح فراہم کرنے کے لیے نہیں ہے، یہ آپ کو تھکانے کے لیے ہے، تاکہ جب آپ تھک کر گر جائیں، تو آپ کو وہ سناٹا سنائی دے جو شور کے نیچے دبا ہوا ہے۔

کائنات کا قانون "اینٹروپیEntropy) ") ہے، یعنی بکھر جانا۔ ہر چیز جو بنی ہے، اسے ٹوٹنا ہے۔ اور میرے نزدیک، اس ٹوٹنے میں ایک عجیب قسم کی خوبصورتی ہے۔ ایک نئی نویلی عمارت میں وہ کشش نہیں ہوتی جو ایک قدیم، گرتی ہوئی دیوار میں ہوتی ہے۔ زوال ہمیں عاجزی سکھاتا ہے۔ مغرب نے ہمیں "پرفیکشنPerfection) ") کا دیوانہ بنا دیا ہے، ہم ہر چیز کو بے عیب دیکھنا چاہتے ہیں، ہم بڑھاپے کو چھپاتے ہیں، ہم موت سے بھاگتے ہیں، ہم غم کو دواؤں سے دباتے ہیں۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں :اپنے زخموں کو مت چھپاؤ، اپنی ویرانی سے مت ڈرو۔ جو شخص یہ قبول کر لیتا ہے کہ "سب کچھ ختم ہو جائے گا"، وہی شخص خوف سے آزاد ہوتا ہے۔ قیامت کوئی ایسا دن نہیں جو مستقبل میں آئے گا، قیامت وہ لمحہ ہے جو ہر روز گزر رہا ہے، اور ہم اسے محسوس نہیں کر رہے۔

آج کی دنیا کا المیہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس معلومات کی کمی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس "دانائی " کا قحط ہے۔ ہم نے خاموشی کو کھو دیا ہے۔ ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم خاموش ہوئے تو ہمیں اپنے اندر کا خالی پن کھا جائے گا۔ اسی لیے ہم مسلسل بولتے ہیں، مسلسل اسکرینوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے خدا کو تلاش کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہم نے " گوگل " کو خدا بنا لیا ہے۔ لیکن یاد رکھیں، سچائی شور میں نہیں ملتی، سچائی ہمیشہ "وقفےPause) ") میں ملتی ہے۔ وہ وقفہ جو سانس لینے اور نکالنے کے درمیان ہوتا ہے، وہ وقفہ جو دل کی ایک دھڑکن سے دوسری دھڑکن کے بیچ ہوتا ہے۔ میری کتابیں اسی وقفے کی تلاش ہیں۔

میں اس ایوارڈ کو قبول کرتا ہوں، لیکن ایک انتباہ کے ساتھ۔ آپ مجھے عزت دے رہے ہیں، لیکن کیا آپ میرا پیغام سن رہے ہیں؟ ہم ایک "تہذیبی الزائمر " کا شکار ہو رہے ہیں جہاں ہم بھولتے جا رہے ہیں کہ انسان ہونے کا اصل مطلب کیا تھا۔ انسان ہونے کا مطلب بھاگنا نہیں، ٹھہرنا ہے۔ انسان ہونے کا مطلب فتح کرنا نہیں، بلکہ شکست کو وقار کے ساتھ گلے لگانا ہے۔

آخر میں، میں آپ کو صرف ایک ہی نصیحت کروں گا" :دیکھنا سیکھیں۔ "صرف اوپر کی سطح کو نہیں، بلکہ چیزوں کی گہرائی کو۔ اس دنیا کی بدصورتی میں بھی ایک حسن چھپا ہے، اس شور میں بھی ایک موسیقی ہے، اور اس مایوسی میں بھی ایک آزادی ہے۔ جب آپ امید چھوڑ دیتے ہیں، تب آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اور جب آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا، تب آپ حقیقی معنوں میں آزاد ہوتے ہیں۔

CS CamScanner

"گراں ولی" ہزارہ کی قدیم ثقافت کا ایک پہلو

عبدالوحید بسمل/ ایبٹ آباد

قارئین کرام اس امر سے تو بخوبی واقف ہیں کہ برصغیر پاک و ہند پر ماضی میں کئی صدیوں سے باہر سے آنے والی اقوام کی حکومت رہی جس کی وجہ سے یہاں کی مقامی آبادی اپنی معاشرتی ومعاشی زندگی اپنی مدد آپ کے اصولوں پر گزارنے پر مجبور رہی۔ پھر آبادی کا تقریباً ۷۵ فیصد حصہ چھوٹے بڑے مضافات (گاؤں، دیہاتوں) میں ہی آباد رہا اور ابھی تک ہے۔ انگریزی دور میں معاشی اور معاشرتی ترقی سے زیادہ گورنس پر توجہ دی جاتی رہی اور عوام کو اپنی ضروریاتِ زندگی اور شخصی و خانگی اور مجموعی حفاظت اور جیون کے دیگر مسائل ومعاملات مقامی سطح پر خود ہی دیکھنے اور حل کرنے پڑتے رہے۔ ان حالات میں کچھ اصول وضع کرنے اور ان پر عمل درآمد کرنا اور کرانا بھی لازمی ہوا چنانچہ ہر علاقے میں بسنے والوں نے اپنی اپنی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ قواعد و ضوابط بنا لئے اور ان پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارتے رہے۔ خیر یہ تو ایک وسیع عنوان اور الگ تفصیل ہے جس پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہمیں تو اس مضمون میں ہزارہ کے کچھ مضافاتی قدیم ثقافتی پس منظر میں معاشرتی اقدار کے ایک پہلو جس کو ہندکو زبان میں "گراں ولی" کہتے ہیں اس پر بات کرنی ہے۔

"گراں ولی" کسی ایک گاؤں میں زندگی بسر کرنے کے اصول اور رسوم و رواجات کے مجموعی تاثر کو ظاہر کرنے والی اصطلاح ہے۔ جو اپنے اندر کافی تفصیل اور وضاحت کا مادہ رکھتی ہے۔ معنوی اعتبار سے اس اصطلاح کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسے اردو میں گھر سے گھرہستی ہے اسی طرح ہندکو زبان میں گراں ("گاؤں") سے گراں ولی ہے یعنی گاؤں کے معاملات کی نگہداشت۔ یہ اصطلاح بہت پرانی سمجھی جاتی ہے جو کہ اپنی نوعیت میں آجکل کے نظریہ مقامی حکومت کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے کہ یہ نظامِ "گراں ولی" صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور ہر علاقے اور گاؤں میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ رائج رہا ہے اور موجودہ ترقیاتی سہولیات اور میڈیائی ثقافتی ادغام میں اپنا دم گھٹنے کے باوجود ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اگر ہم اس طرزِ رہن سہن کو آج سے تیس چالیس سال پہلے کے زمانے میں دیکھیں تو یہ ہزارہ کی دیہی معاشرتی زندگی میں پوری طرح نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ البتہ شہری زندگی پر اس کا پورا پورا اطلاق ضروری نہیں کیونکہ شہری اور دیہی طرز معاشرت میں ذریعہ معاش کے فرق کے ساتھ ساتھ دیگر کئی حوالوں سے اچھا خاصا فرق موجود رہا ہے جو کہ ابھی تک موجود ہے۔ البتہ شہروں میں گراں ولی کی بجائے "محلے داری" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی جو ابھی تک چلی آرہی ہے۔ اس میں بھی اجتماعی امور حیات کے مسائل اور معاملات سے نبٹنے کے اصول وضوابط طے کئے جاتے ہیں اور پھر ان کی پاسداری سے بہت سے اجتماعی امور آسانی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

ماضی میں گاؤں کی زیادہ تر آبادی کا بڑا ذریعہ معاش صرف کھیتی باڑی ہی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے تقریباً سارے ہی معاملات کی ادئیگیاں بھی فصلوں کے پکنے اور تیار ہونے کے ساتھ منسلک تھیں۔ اسی تناظر میں گاؤں کے کسبی اور معاونین کا تعین اور انکی محنت کی اجرت کے دورانیے کا تعین اور ادائیگی کا طریقہ کار بھی موجود تھا۔ گراں ولی میں ہر گاؤں کی ایک جغرافیائی حد کا تعین کیا جاتا تھا۔ اس تعین میں مسجد بھی ایک اہم کردار ادا کرتی تھی۔ کیونکہ عموماً کسی بھی گاؤں کی ایک مسجد اس کا ایک امام اور مسجد کے انتظامی امور کا ایک ذمہ دار شخص ہوتا تھا جس کو خادم کہا جاتا تھا۔ پھر زمینداری (زراعت) کے امور میں کام آنے والے اوزاروں کی تیاری اور مرمتی کے لئے گاؤں کا ایک مشترکہ لوہار اور ترکھان رکھا جاتا تھا یہ دونوں کام عام طور پر ایک ہی کاریگر کیا کرتا تھا۔ اسی طرح دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک مشترکہ خلیفہ (حجام) اور ایک چرم دوز (موچی) ایک آدھ کمہار، جولاہا، دُھنیا (پینجا) اور کہیں کہیں بہشتی (ماشکی) بھی رکھے جاتے تھے البتہ کمہار، جولاہا، دھنیا اور ماشکی گراں ولی کی مشترکہ ادئیگیوں اور معاہدوں کی شرائط سے ہٹ کر اپنا اپنا کام کر کے اجرت لے سکتے تھے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہزارے کی معاشرتی زندگی میں گراں ولی مقامی طور پر ایک مستحکم اور با اختیار ادارے کی حیثیت سے دیکھی جاسکتی ہے۔ جس

CamScanner

کی اہمیت اور ضرورت کو مزید سمجھنے کے لئے درج ذیل عنوانات کا جاننا معاون اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے:۔

☆ گاؤں کا معتبر (بڑکا یا بڑیرا) : یعنی منتظم

☆ گراں ولی کے دائرے میں آنے والے امور: یعنی اختیارات

☆ گراں ولی سنبھالنا: یعنی فرائض

☆ گراں ولی کی جبوب (اجرتیں باہمی رضامندی سے) یعنی نظام مالیات

☆ گراں ولی کے فیصلے: (معمولی تنازعات کی صورت): یعنی نظام انصاف

☆ گراں ولی اور جرگہ : یعنی مقامی عدالت

☆ گراں ولی کے اصول توڑنے پر سرزنش: یعنی مواخذہ

گاؤں کا معتبر: (بڈا، بڈیرا)

گراں ولی کے امور کی نگہداشت کے لئے گاؤں کے باسی عموماً ایک اجتماع میں کسی ایک بندے کو اپنا بڈیرا چن لیتے ہیں، پھر یہ بڈیرا گراں ولی کے پہلے سے چلے آنے والے اصولوں یا کسی نئے طے کئے جانے والے اصول کی پاسداری کرنے اور سب گاؤں والوں سے پابندی کرانے کا ذمہ دار مانا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں گاؤں کے تقریباً سبھی باسی شرکت کرتے ہیں البتہ اگر کوئی شریک نہ ہو سکے تب بھی وہ اس انتخاب کی توثیق کر دیتا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں ایک سے زیادہ برادریوں (قبیلوں) کے لوگ رہتے ہوں تو ہر برادری اپنا ایک بااختیار نمائندہ بھیج کر بھی اس انتخاب میں شامل ہو سکتی ہے اور ہر گھر سے سارے لوگ بھی شرکت کر سکتے ہیں۔ بڈیرا یا معتبر بننے کے لئے بھی ایک معیار مدنظر رکھا جاتا ہے جس میں منتخب کئے جانے والے فرد کی عمر، اسلامی علمی سوجھ بوجھ، سماجی سوچ وفکر، راست بازی اور شرافت، انصاف پسندی، سچ گوئی، سماجی کاموں میں ماضی کے کارہائے نمایاں، اور اسی طرح کی دیگر اچھی اور صحت مند کارگزاریوں کا ریکارڈ مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی گاؤں میں اگر بہت سے قبیلے آباد ہوں تو ہر قبیلہ اپنا ایک نمائندہ بطور معاون ومددگار بھی نامزد کر سکتا ہے جو زیادہ نازک معاملات میں بڈیرے کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ (یہ نظام اگرچہ اب کمزور ہو چکا ہے مگر پھر بھی ہزارے کے اکثر دیہاتوں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور بہت سے اجتماعی امور خوش اسلوبی سے طے پا رہے ہیں)۔

گراں ولی کے اختیارات:

جب ایک معتبر منتخب کرلیا جاتا ہے تو پھر گراں ولی کے اصولوں کے مطابق اسے بہت سے اختیارات بھی حاصل ہو جاتے ہیں جن میں کچھ اختیارات پر یوں بات ہو سکتی ہے:

گاؤں کے امام صاحب اور خدمت گاروں پر محنت کشوں (ہاتھ سے کام کرنے والے یعنی لوہار، ترکھان، موچی، خادم وغیرہ) اور بچوں کو دینی و بنیادی اخلاقی تعلیم دینے کے لئے معلم کا بندوبست کرنا۔ باہمی رضامندی سے ان کی اجرتوں کا تعین اور ادئیگی کا وقت اور طریقہ کار وضع کرنا اور سب گاؤں والوں کو اس سے مطلع کرنا۔ شادی بیاہ اور موت مرگ کی صورت میں تقریبات اور تدفین کے حوالے سے اجتماعی ذمہ داری کے جذبے کو اجاگر کرنا اور ہونے والے کاموں کی نگرانی کرنا۔ کسی کی کوتاہی کو دیکھتے ہی ازالہ اور درستی کا اہتمام کرنا۔

ان امور میں کبھی کبھار گاؤں کے دو چار اہل الرائے افراد کی معاونت بھی لی جاتی ہے۔ اور پھر دونوں جانب (بڈیرا اور خدمت گار) سے رضامندی حاصل ہونے پر ادئیگیوں کی مقدار اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ معائدہ عموماً ایک سال کے لئے ہوتا ہے مگر اس کی مزید توثیق ہر سال ہوتی رہتی ہے تاوقتیکہ کوئی بھی فریق پیشگی اطلاع بہم پہنچا کر اس کی مکمل یا کسی بھی شرط کی تنسیخ نہ کرے۔ ادئیگیوں کی مقدار میں حالات کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مگر دونوں طرف سے ماننے کی صورت میں۔ یہ ادئیگیاں روپے پیسے کی بجائے فصل تیار ہو جانے پر جنس کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں جن کی مقدار ہر خدمتی کے کام کے مطابق پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔

اگر کوئی خدمت گار معائدہ ختم کر دے تو نئے بندے کا بندوبست بھی بڈیرے کے ذمے ہوتا ہے اور پھر اس بندے کو گاؤں لانے اور بسانے کا انتظام بھی وہی کرتا ہے جس کے لئے گاؤں کے باسیوں میں سے چند بندوں کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے جو جا کر نئے خدمت گار کا سامان وغیرہ گاؤں تک لاتے ہیں۔ اس کو ہندکو میں 'کڈا مُو ہڑا' لانا یا ڈیرہ لانا بھی کہا جاتا ہے۔

گاؤں کی مسجد، حجرہ (اگر کوئی ہو تو) قبرستان، شادی بیاہ اور ماتم کے معاملات، چھوٹے موٹے تنازعات کا تصفیہ، مجموعی کھیتی باڑی کے کام (حاشر، جوڑیاں، گھاس کٹائی، کوٹی، گاہ وغیرہ)، کچے مکانوں اور مال مویشی کے باڑے (باندیاں، ڈھارے وغیرہ) کے لئے چھتوں اور دیواروں میں استعمال

ہونے والے سامان کی فراہمی، بیماری کی صورت میں مریض کی چارپائی اٹھا کر ہسپتال تک لے جانا اور واپس لانا، شادی بیاہ اور ماتم کے حوالے سے منعقد ہونے والی مختلف تقریبات میں بلائے جانے والے سیکڑوں مہمانوں کے لئے تیار کئے جانے والے کھانے پکانے کے لئے بالن اور شب گزاری کے لئے بستر، چارپائیوں کی فراہمی جیسے امور بھی گراں ولی کے سپرد ہوتے ہیں جو اپنے اپنے گاؤں کے طے شدہ اصولوں کے مطابق سرانجام دئے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک لمبی چوڑی تفصیل ہے جس کی اس چھوٹے سے مضمون میں گنجائش نہیں بنتی البتہ اس تفصیل سے آگاہی کے لئے میری ہندکو تصنیف بعنوان ''ہندکو رہتل'' سال طباعت ۲۰۲۴ء ناشر نستعلیق مطبوعات غزنی سٹریٹ لاہور ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

گاؤں کے معتبر نے ایسے موقعوں پر خود موجود رہ کر سارے کاموں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے اور انفرادی و مجموعی عزت و وقار کی حفاظت بھی کرنی ہوتی ہے۔

گراں ولی کے اصول توڑنے کی سرزنش (سزا)

اگر کوئی گرائیں (گاوں کا رہائشی) بغیر کسی معقول وجہ کے گراں ولی کے اصولوں یا کسی ایک اصول کی بھی خلاف ورزی کا مرتکب ہو تو اس کی یہ حرکت بڈیرے کے علم میں لانا دیگر گرائیوں کی مجموعی اور انفرادی ذمہ داری خیال کی جاتی ہے۔ پھر بڈیرے کا کام ہے کہ اس کی سرزنش کرے۔ اس بات کا فیصلہ اس کے کئے گئے جرم کے ثابت ہونے پر کیا جاتا ہے۔ عموماً ایسے شخص کو تنبیہ کے طور پر گراں ولی سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسے اپنے سارے کام اکیلے میں کرنے پڑتے ہیں جو کہ اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اگر جرم کی نوعیت زیادہ سنگین ہو تو جرگہ بلایا جاتا ہے۔ جرگے کا فیصلہ عموماً انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ جرگے میں انتہائی سمجھدار، معاملہ فہم اور جہاں دیدہ افراد کی شمولیت یقینی بنائی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر کوئی مستند عالم دین بھی اس جرگے کا حصہ ہوتا ہے۔

گراں ولی کی اہمیت پر غور کیا جائے تو یہ ایک ایسا مقامی سطح پر کام کرنے والا نظام زندگی سمجھا جا سکتا ہے جس میں امن و امان کی فضا قائم رکھنا بھی سہل اور بہت سے معاملات زندگی میں اجتماعی شمولیت سے وقت اور محنت کی بچت کے ساتھ روزمرہ کے امور اور تقریبات کا انعقاد نہایت آسانی اور بغیر کسی ٹینشن کے سرانجام پا سکتے ہیں۔ پھر باہمی تنازعات اور گھریلو چپقلشوں کے نتیجے میں ایکدم بڑے ہو جانے والے معاملات بلکہ جرائم کے تصفیوں پر تھانے کچہریوں کے چکر لگانے اور وکیلوں اور دیگر مجاز اداروں کی فیسوں پر اٹھنے والے اخراجات سے بچ کر آجکل کے بہت سے ایسے امور آسانی سے نمٹائے جا سکتے ہیں جن کا گراں ولی سے ہٹ کر ذاتی حیثیت میں سرانجام دینا بہت سے پیسوں کے بے جا استعمال، ذہنی کوفت اور پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ جبکہ گراں ولی میں اس کا علاج موجود ہے۔

عبدالوحید بسمل

غزل

بنی آدم سے لڑتے ہیں بنی آدم ہی کیوں آخر
قصور ان کا بتائے کون، پوچھوں کس سے میں جا کر

کہیں کلیاں چٹکتی ہیں کہیں ہیں پھول بھی سوکھے
امارت پاس رکھتی ہے جو اپنے مشغلے وافر

اسی کا نام آتا ہے جہاں دیکھوں جہاں بھالوں
ہے دولت کا کرشمہ جو دکھائے عام کو برتر

تفاوت اس قدر دیکھا کہ آنکھیں موند لیں میں نے
کوئی سلطان بن بیٹھا، کوئی نوکر، کوئی تاجر

کوئی مضروب دنیا ہے کوئی مارا ہے رسموں کا
کوئی مقروض اداروں کا، کوئی رکھتا ہے گروی گھر

حفاظت کون کرتا ہے کسی فرقت کے مارے کی
زمانہ اس کو کہتا ہے چلو اب تم رہو ماتر

کہیں انجام سے واقف جو ہم دنیا میں ہو جائیں
تو بسمل ڈھونڈ پائے کب کہیں ظالم کہیں شاطر

مزاحمتی مرغے

قرۃ العین حیدر

دادا ہمارے کہا کرتے تھے کہ جو اچھی غذا نہیں کھاتا، اس کو بری دوا لینا پڑتی ہے۔ وہ خود علاج بالغذا کے ایسے اعلیٰ مؤید تھے کہ ہر بیماری کا علاج صرف غذا سے کرنے میں یقین رکھتے۔ شاید ہی کبھی ڈاکٹر کے پاس گئے ہوں۔ ان کے کچھ دوست یار ڈاکٹر تھے، ان کے پاس صرف سگریٹ پینے جایا کرتے۔ ایک آدھ دفعہ اگر انجکشن لگوانے چلے بھی گئے تو پہلوانی یعنی باڈی بلڈنگ کے زعم میں مسلز (پٹھے) یوں اکڑا لیتے کہ ڈاکٹر کی چھوٹی سوئی اندر نہ جا سکے، پھر ایسے قصے سب کو سناتے۔

دادی اماں کا ایک بار ایکسیڈنٹ ہوا، ان کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں تو دادا نے گھر میں ہی علاج کیا تھا۔

میں نے حیرت سے دادی اماں سے پوچھا

کیسے کیا تھا؟

کہنے لگیں، بڑے کا قیمہ، چانپ اور پٹھ کی یخنی اور دیسی مرغ کا شوربہ۔

میں پھر حیران دادی اماں، اس سے پسلیاں کیسے جڑ سکتی ہیں؟

خیر، انہوں نے بتایا کہ کچھ مرہم بھی گھر ہی بنائے، لیکن زور سارا کھانے سے علاج پر تھا۔

ان کا اپنا پیشہ سپاہ گری تھا، پنجاب پولیس میں تھے۔ البتہ دہلی میں محلہ حکیماں کے قربت کا اثر یہ تھا کہ پولیس والے کم اور حکیم زیادہ بن چکے تھے۔

دیسی مرغا ہمارے گھر میں ایک وقت تو روٹین میں ہی بنا کرتا تھا، پھر جنک فوڈ یعنی سلیس اردو میں کباڑ کھانا اور برائلر کے آنے اور بچوں کے اسے پسند کرنے کے بعد کباڑ کھانے کی ایسی بھرمار ہوئی کہ دیسی مرغا ہمارے دسترخوان سے آہستہ آہستہ غائب ہوتا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں احساس ہوا کہ ہماری ہڈیوں کو مضبوطی اور جسم کو طاقت کی ضرورت ہے سو توانا و تندرست و اصیل دیسی مرغا ڈھونڈنے کا جنون پیدا ہوا۔

ہم نے کہیں سے نسلی چوزے خریدے اور خود مرغیاں پال لیں۔ گھر کرائے کا تھا نیچے ہم اور اوپر مالک مکان رہتے تھے۔ چھ عدد مرغیاں اور ایک بدقماش سا مرغا آخری چیخ رات کو بارہ ایک بجے مارتے تھے اور پہلی چیخ صبح چار بجے تو یوں کل ملا کے ہمیں صرف دو سے تین گھنٹے سونے کے نصیب ہوتے تھے۔ اور ہمیں صرف دو سے تین گھنٹے سونے کے نصیب ہوتے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ مالک مکان ہمیں گھر سے نکال دیتے، ہم نے ایک ایک کر کے مرغیوں کو اُن کے ڈربے سے نکالا، آدھی مالک مکان کو پیش کیں اور آدھی ہم نے کھا لیں۔

اس کے بعد مصری یا ہائبرڈ قسم کے مرغے، جو دیسی کہہ کر بیچے جاتے ہیں، اس پر پیسے ضائع کئے لیکن اس کی جینیاتی ساخت اور ذہنی اُپج سے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے ان سے زیادہ عرصہ نبھانہ ہو سکا۔

ہمارا خیال ہے کہ مرغا وہی ہونا چاہیے جو کیڑے، دانہ دنکا، ڈھونڈ کر چگنے والا ہو، اپنی مرضی کی زندگی گزارتا ہو، مرضی کے مطابق ٹھونگیں بھی مارتا ہو، جری اور جرار صفت ہو،

دو چار مرغوں کا opinion leader بھی ہو اور برا وقت آنے پر تھوڑا بہت سہی، لیکن اڑ کر، بھاگ کر جان بچا سکے۔

ہمارے گھر کے پیچھے برائلر مرغی بیچنے والے قصائی سے ان موضوعات پر بات چیت ہوتی ہے، اس بھلے مانس نے ایسی ہی کسی گفتگو کے دوران پنجرے میں کھلے دروازے کے سامنے ڈھیر، روئی کے گالوں جیسی سفید مرغیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا باجی جو خود چل کر اپنی جان نہیں بچا سکتی، وہ آپ کی جان کیا بنائے گی؟

یہ کہہ کر اس نے پنجرے میں بیٹھی ایک محوِ خرام اور سست ترین مرغی کو جھپٹ کر اس پر تکبیر پڑھی۔ اس مرغی میں نہ زندگی کی رمق تھی، نہ زندہ رہنے کا شوق نہ بچاؤ کا کوئی گر۔ جیسی بددلی سے وہ زندہ تھی، اسی بددلی سے وہ مذبح خانے والی چمنی میں کٹی گردن کے بل الٹی لٹک گئی۔

دل اچاٹ سا ہو گیا۔ سوچا اپنا بھی پروٹین کے نام پر ایسی جذبات مزاحمت اور غیرت سے خالی مرغی کھا کر یہی حال ہو چکا ہے۔

دفتر جاتے ہیں، کام کرتے ہیں، گھر آتے ہیں، برائلر مرغی کھاتے ہیں، کتاب پڑھتے ہیں، فیس بک ریل دیکھ کر سو جاتے ہیں۔ دوست بچے ماں باپ، میاں باس - کسی کی بات پر کوئی ردعمل نہیں دیتے۔ زندگی میں مزاحمت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، آہستہ آہستہ اختلاف رائے بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

جو دن کہتا ہے اسے کہتے ہیں دن ہے، جو رات کہتا ہے اسے کہتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔

تف ہے ایسی زندگی پر۔

ایسے زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے۔

یاک (گلگت بلتستان میں پایا جانے والا پہاڑی بیل) کا گوشت کھا کر کولیسٹرول بڑھنے کا خدشہ نہ ہو تو ہم بھی روز اس کے پارچے کھا کر سینگ اگا لیں۔

وائے حسرت ایسے میں ہمارے جیٹھ صاحب

کے توسط سے ہماری ملاقات مرغی کی ایک قسم cockerel کاکرل "سے ہوئی۔"

سنا ہے پنجاب میں انہیں پٹھے کہتے ہیں۔

الو کے نہیں، مرغی کے پٹھے۔

پہلے شاید یہ زیادہ کھائے جاتے تھے، لیکن اب شہروں میں یہ قسم نایاب ہے۔ جن گھروں میں شوقین ہوتے ہیں، صرف وہی انہیں رکھتے ہیں، یعنی جن کا ذہن اور دن ہماری طرح سارا دن دیسی، آرگینک کھانے ڈھونڈنے میں صرف ہوتا ہے۔

کاکرل دراصل وہ کم عمر نوجوان نر مرغ ہوتا ہے جو بلوغت کی دہلیز پر کھڑا بانگیں دے کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کی بانگ مرغے کی طرح پختہ کار ہوتی ہے نہ نظر، تجربہ صفر، جوش سے بھرا ہوا چونکہ اوّل جوانی کا زور اسے نچلا نہیں بیٹھنے دیتا سو اکثر جارحانہ اور مزاحمتی رویہ اپناتا ہے۔ اپنا تو ایمان ہے کہ حلال جانور کی مزاحمت بڑھنے سے پہلے ہی کاٹ کر کھا لینا چاہیے، بعد میں کلغی نکل آئے تو کم بخت ہاتھ نہیں آتا۔ یوں ہماری تلاش ختم ہوئی اور سردیوں میں اس خاص نسل کے نوعمر مرغ کا انتظار رہنے لگا۔

اب جب کاکرل یا پٹھے گھر میں آ جائیں تو گویا عید کا سماں ہوتا ہے۔ اگر مصالحوں کا پورا مجموعہ میسر ہو تو انہیں سورنگ سے باندھا جاتا ہے۔

سردی شروع ہونے سے اب تک چھ مزاحمتی کھا چکے ہیں، لیکن پھر بھی دل میں مزاحمت کا شعلہ نہیں بھڑک رہا۔ اب کی بار ذاتی زمین پر بڑا سا ڈربہ بنوائیں گے، ساتھ اپنے لئے چھوٹا سا گھر بھی بنوالیں گے تاکہ اپنی نگرانی میں اصلی مزاحمتی مرغ کی پرورش کر سکیں اور وقت آنے پر اس کا شوربہ پی سکیں کہ اچھی غذا ہی ہمیں بری دوا سے بچائے گی۔

فائزہ صابری نوا

"خدا اُن پہ گہری نظر ڈالتا ہے"

جو جاگنے نہیں ہیں اِشارہ خدا کا
خدا کہہ رہا ہے
چلو دن چڑھا ہے یہ ہر سُو جگا ہے
چلو تم بھی آنکھوں کے پردے ٹٹولو
اُٹھو کام دھندے کرو اپنے سارے
مگر تم کہت ہو خدارا خدارا۔۔۔۔
ذرا سونے دو نہ ابھی شب کے جاگے
جو جاگیں تو کیسے!
ذرا سونے دو نہ۔۔۔۔۔۔
تو خالق نے بولا یہ سورج تو دیکھو
جو چوکھٹ پہ بیٹھا تمہیں کھوجتا ہے
ہر اک شے کو روشن کیا تیری خاطر
کہ تُو شاد ماں ہو۔۔۔
یہ تم بولتے ہو۔۔۔۔۔
ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں ہم سے ہوگا
یہ بتی بجھائی یہ پردے گرائے
یہ دیکھو اندھیرا کیا ہم نے خود ہی
یہ باتیں پرانی کہ سورج چڑھے گا
تو ہم بھی جگیں گے۔۔۔۔
جو شب ہو چلے گی تو سو جائیں گے ہم!

....

یہ شام آ گئی یے اندھیرا ہے باہر
مگر تم نے بتی جلا لی ہے ہر سُو
سڑک کیا ہے گھر کیا ہر اک جا اُجالا.....

خدارا خدارا۔۔۔۔۔۔
یہ کیا کر رہے ہو؟
اندھیرہ فقط ٹکڑوں میں پڑا ہے
اندھیرے کے ہونے میں برکت پڑی تھی
کہ فطرت ذرہ خُود کو سنبھالتی تھی
اندھیرے میں ٹانکے لگاتی تھی فطرت
جہاں سے گئی تھی جہاں سے پھٹی تھی
بہت کچھ وہ خود ہی صحیح کر کے رکھتی
ابھی دن کے سوئے تُم اب جاگتے ہو
ہٹاتے ہو پردے تو تُم دیکھتے ہو
اندھیرا پڑا ہے یہ کھڑکی سے باہر
جلاتے ہو بتی۔۔۔۔۔ اندھیرا فنا ہے۔۔۔۔
اُلٹ چل رہے ہو اُلٹ کر رہے ہو
پانی ہے ٹھنڈا گرم ہونہ جائے!
جو کھانا گرم ہے گرم ہے رہے وہ
الٹ چل رہے ہو۔۔۔
بہت خوف اندر پڑے ہیں تمہارے
کہیں یہ ہوا تو!!!!! کہیں وہ ہوا تو!!!!!،
جو فطرت سے ضِد اِنتہا کر چلے ہو
مگر یاد رکھو۔۔۔۔۔۔
جو ضِد کی طنابیں کُمر ڈالتا ہے
خدا اُن پہ گہری نظر ڈالتا ہے

✦✦✦

افسانہ

’’پہچان‘‘

بلقیس ریاض

وہ کھڑکی میں کھڑی آسمان کی وسعتوں میں شفق سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ زندگی کے اتنے سال بیت گئے....شادی ہوئی تو اوپر تلے چار بچے بھی ہو گئے....اس کے میاں کی پوسٹنگ لندن میں ہوئی تو والدین کو اداس چھوڑ کر بمعہ بچوں کے لندن چلی گئی. زندگی میں پہلی بار اس سرزمین میں اس نے قدم رکھا تھا۔ پاکستان کے ماحول کے مطابق بہت ہی فرق تھا....وہ ایک مشرقی لڑکی تھی....موڈرن فیملی سے اس کا تعلق نہیں تھا....مگر اس سرزمین میں....دوسرے پاکستانی....بالکل یورپین زیادہ اور پاکستانی کم دکھائی دیتے تھے....عروج کو لندن سیر کیلئے پسند تو آیا مگر وہاں کی آزاد زندگی دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ خاوند کی پوسٹنگ U.K. کے بینک میں ہوئی تھی روز کا چکر تھا پھر ہر کوئی باہر جاتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب کمائے اور واپس جب پاکستان جائے تو بقایا زندگی آرام سے گزرے....بیٹے بڑے تھے اور بیٹیاں چھوٹی تھیں....لڑکوں کو سکول میں ڈال دیا تھا....اور بچیاں جو جڑواں تھیں....ابھی ایک سال رہتا تھا۔ عروج نے ایک روز سلمان سے کہا کم کھا لیتے....تو پاکستان میں ہی رہتے۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں۔ ماحول بھی بڑا آزاد ہے۔

کیسی باتیں لے بیٹھی ہو۔ جنرل منیجر نے میری کارگردگی دیکھ کر یہاں بھیجا ہے....میرے کولیگز کی خواہش تھی کہ باہر چانس مل جائے۔ میری قسمت اچھی تھی اور مجھے انہوں نے سلیکٹ کیا....یہ تو تمہاری تربیت پر منحصر ہے کہ تم کیسے پالتی ہو۔ زمانہ بدل گیا ہے اور مزید اور بدلے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو....ابھی سے ان دونوں کا نام سکول میں لکھوا دو...شکر نہیں کرتی کہ یہاں پر تعلیم فری حاصل کریں گی اور پھر اگر مزید اور سال رہے تو جاب بھی کر لیں گی....دل بڑا کرو۔ میں نے تو نیشنلٹی بھی حاصل کرنی ہے۔

عروج....کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

گھر کے قریب ہی بہت بڑا پارک تھا....وہاں صبح کے وقت انگریز عورتیں مرد واک اور جاگنگ کرنے آتے....سلمان ناشتہ کرنے کے بعد وہ دونوں بیٹوں کو گاڑی میں بٹھا کر پہلے ان کو سکول ڈراپ کرتا پھر اپنے بینک کا رخ کرتا۔

عروج دونوں بچیوں کو لے کر سڑک کراس کر کے پارک میں لے گئی....صاف ستھرا بہت بڑا پارک...چار سو....پھولوں کے پودے اور بڑے بڑے درخت....ہوا کے ہلکوروں سے جھوم رہے تھے. وہاں کا سماں ہی نرالا تھا....ہر کوئی اپنی دھن میں مست واک کرنے میں مصروف تھا....وہاں اس پارک میں پاکستانی لباس میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.مگر عروج بڑے سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی تھی. اپنی اوقات اور حد میں رہنے والی....اس وقت صبح کے نو بجے تھے....پارک سرسبز اور پھولوں کے پودوں سے بھرا تھا....بڑے بڑے درخت پارک کے کناروں پر استادہ تھے....ایک طرف آبشار تالاب میں بہہ رہی تھی....عروج اس وقت بہت ہی محظوظ ہو رہی تھی. موسم پاکستان کی نسبت خنک تھا....بچیاں ماں کے ساتھ چلتے ہوئے بہت خوش ہو رہی تھیں. ایک طرف بچوں کے جھولے لگے ہوئے تھے....کئی بچے اس میں جھولا جھولتے ہوئے نظر آ رہے تھے. بچیاں بہت خوش ہو رہی تھیں....سیر کرنے کے کچھ دیر کے بعد وہ گھر لوٹ آئی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور عروج نے گھر کے قریب ان دونوں کو سکول میں داخل کر دیا....ایک لحاظ سے سلمان اور عروج شاہانہ زندگی گزار رہے تھے....سڑک کے کنارے ایک ہی طرز کے گھر تھے....ہر گھر کی کھڑکیوں میں سفید لیس کے پردے دکھائی دیتے تھے....قریب ہی مارکیٹ تھی....بچیوں کو سکول میں بھیج کر وہ گروسری کرتی....کھانا بناتی....اس ملک میں بھی اس قدر مہنگائی تھی کہ کوئی ملازم نہیں رکھ سکتے تھے.

عروج گھر کی صفائی کرتے ہوئے بہت تھک جاتی تھی....تو وہاں صفائی ہفتہ وار ایک لڑکی سے کروانی شروع کر دی....وہ ہر ہفتے سو پاؤنڈ صفائی کا لیتی....دونوں ہر حال میں خوش تھے...ویسے تو بہت آرام تھا۔ مگر وہاں کی آزادی عروج کیلئے بڑی جان لیوا تھی۔ اس نے بچپن سے ہی انہیں قرآن اور اسلام کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ چاروں بچوں کو اسلام کے بارے میں درس بھی دیتی تھی۔ گھر کے کاموں کے علاوہ بچوں کی اچھی تربیت پر بھی بہت توجہ دیتی تھی۔ مچھر، مکھی اور دیگر کیڑے مکوڑوں سے محفوظ امن اور چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ آس پاس کے گھروں میں مقیم...لندن کے رہنے والے یورپین رہائیشی اور انگریز تھے....آہستہ آہستہ ان کے ساتھ دوستیاں ہو گئیں اور ان دونوں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھال دیا....کچھ عرصہ کے بعد وہاں کی نیشنلٹی حاصل کر لی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا....اور بیٹے اور بیٹوں کی مخلوط تعلیم تھی....دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑے ہو گئے۔

سلمان گولہ پاکستانی بینک سے ریٹائرمنٹ ہوگئی تھی مگر لندن میں رہتے ہوئے اس نے نیشنلٹی حاصل کر کے اپنے قدم مضبوط کر لیے تھے.....اور اپارٹمنٹ کے بعد ایک اچھے علاقے میں گھر لے لیا تھا....ہر طرح سے ان کی زندگی پرسکون تھی مگر والدین بہت یاد کرتے اور کہتے.....کہ سال میں ایک مرتبہ بھی آ جاؤ تو دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ ماں نے فون پر سلمان کو کہا۔

ماریہ اور روزینہ دونوں کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی

ہے....ادھر ناظم نے بیٹوں کی شادیاں کرنی ہیں وہ بھی برسرروزگار ہوگئے ہیں. بچپن میں جو طے پایا تھا اس کے مطابق ہمیں ان کی شادیاں کر دینی چاہئیں. بولو....اب تو تمہاری بیٹیاں بھی تعلیم حاصل کر چکی ہیں....سلمان نے ماں سے کہا....فکر ہی نہ کریں ہم نے آج تک ان کو نہیں بتایا تھا کہ تمہاری شادیاں پاکستان میں کریں گے. اب وقت آگیا ہے کہ ان کو بتادیں گے بلکہ اس مرتبہ ہم سب پاکستان آئیں گے اور بچے آپس میں مل لیں گے.

بچوں کو ملنے کی ضرورت ہی نہیں ہے....ان دونوں نے رفیق کے بچوں کو دیکھا تو ہے....ہمارے خاندان میں بڑوں کے فیصلے چلتے ہیں.

لیکن اماں جان وہ لندن میں تعلیم حاصل کر چکی ہیں. بچوں کا آپس میں ملنا بہت ضروری ہے.

اچھا....جیسے تمہاری مرضی....مگر ان کی شادیاں شہزاد اور راحیل سے ہی ہوں گی.

درست کہا ہے....ایسا ہی ہوگا.

فون بند ہوگیا تو....سلمان نے ساری باتیں عروج کو بتائیں.

وہ خاموش ہوگئی. لیکن دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہاں ان کی شادیاں نہ کروں تو یہاں مسلمان گھرانوں میں لڑکے تلاش کرنے پڑیں گے. وہ تھوڑی سی مطمئن ہوگئی. عروج نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر....دادی کا فیصلہ سنایا تو دونوں ہی ہنس پڑیں.

ماما کیسی باتیں کرتی ہیں....ہم نے آنکھ لندن میں کھولی ہے اور پاکستان ہمیں بالکل ہی پسند نہیں آیا تھا....اتنی ڈسٹ، فوگ، مچھر، مکھیوں سے دادی اماں کا صحن بھرا رہتا تھا....اور مچھر تو رات بھر سونے نہیں دیتے تھے.

لڑکے بڑی اچھی پوسٹ پر لگے ہوئے ہیں....تم دونوں ان کے ساتھ جہاں ان کے تبادلے ہوں گے....ساتھ ساتھ رہنا اور مرضی سے اپنے اپنے گھروں کو ڈیکور کرنا....ہم لوگوں نے بھی زندگی وہی گزاری ہے اور تم لوگوں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے.

روزینہ خاموش ہوگئی....اور ماریہ نے ماں سے کہا ماما پلیز ہم پاکستان میں شادی نہیں کریں گی....اتنا پڑھ لکھ کر یہاں ملازمت کرنا چاہتی ہیں.

زیادہ تکرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے. بچپن میں دادی نے فیصلہ کر دیا ہے اس پر ہم نے عمل کرنا ہے.

کیوں.

اس لئے کہ ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا....ان کے دونوں بیٹے بہت لائق ہیں....اور اچھی پوسٹ پر ہیں....عزت کے ساتھ اس گھر میں رہیں گی. ملازمت کی کیا ہے پاکستان میں بھی کرسکتی ہیں.

ماریہ شام کے وقت Hide park پہنچ کر....ایک بینچ پر بیٹھ گئی. اس وقت لوگ واک کر رہے تھے....آسمان پر بادل چھائے تھے....خنک ہوائیں چل رہی تھیں....وہ اس وقت بہت ہی پریشان تھی. لوگ قریب سے گزر رہے تھے....مگر ہر کوئی دوسرے سے لاتعلق تھا....ایک ایسی جگہ تھی جہاں پر وہ کھڑے ہو کر ہر دل کی بات کر دیتے تھے....کوئی بھی ملک میں غلط فیصلہ ہو رہا ہو تو اس کا احتجاج بھی کرتے تھے....آج بھی ایک شخص بول رہا تھا کچھ لوگ اس کی باتیں سن رہے تھے.

آپ کو جو اچھا لگے....اس پر قائم رہیں....یہ نہیں کہ دباؤ پر آن کر اپنی زندگی کے غلط فیصلے کر لیں....زندگی بہت قیمتی ہے....اس کو خوبصورت بنائیں اور اپنے لئے اچھا سوچیں.

ابھی اس کی باتیں اتنی ہی سنی تھیں کہ ڈیوڈ آگیا.

سوری ماریہ دیر ہوگئی....اور اس نے ماریہ کی خوبصورت آنکھوں پر اپنی شوخ نگاہیں ڈالیں....تو اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے.

کیا ہوا....تم اتنی پریشان ہو....اور تمہارے آنسو.

ڈیوڈ شاید ہم کبھی نہیں مل سکیں گے.

کیوں.

والدین پاکستان میں شادی کرنا چاہتے ہیں.

اور تم.

''میں تم سے......؟''

''کیا تم مسلمان ہو جاؤ گے؟''

کیسی باتیں کرتی ہو یہاں شادیاں اکثر شوہر کرسچن ہے تو بیوی مسلمان اور لڑکا مسلمان ہے تو بیوی کرسچن تم دیکھتی تو ہو....میں مسلمان ہو بھی جاؤں تو میرا کلچر وہی رہے گا. اکثر شادیاں کامیاب رہتی ہیں....آج میں تمہیں کورٹ میں لے جا کر شادی کر لوں تو والدین خوش ہوں گے میں نے زندگی کا فیصلہ خود کرلیا ہے. ساری زندگی یہاں رہی ہو....یہاں کا ماحول اپناؤ....ڈیوڈ بچپن میں ہم ایک ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں....صرف کیفے ٹیریا تک ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ تمہارے کلچر اور رہن سہن کیسا ہے. اب سالگرہ پر آؤ گی. جوزف کو جانتی ہو....ایک کلب میں سالگرہ منا رہے ہیں....ہمارا کلچر تم دیکھ ہی لوگی. شادی کے بعد تمام لڑکیاں اسی کلچر کو اپنا لیتی ہیں....ہمیشہ خوش رہو گی. ڈیوڈ کی باتیں سن کر وہ تھوڑی سی مطمئن ہو گئی....اور ڈیوڈ نے کہا....آج ایک پارٹی ہے....ایک دوست کی سالگرہ ہے. تم نے ضرور آنا ہے. میں چاہتا ہوں تم آؤ اور دیکھ لو شادی سے پہلے ہماری تقریبات کیسی ہوتی ہیں. یہ کہتے ہوئے وہ اپنے اپنے گھروں میں چل پڑے اور ڈیوڈ نے کہا....کہ رات کو ضرور آنا اور روزینہ کو بھی لانا ہے اور ماریہ نے جواب دیا....ضرور آؤ گی.

ماریہ نے ماں سے کہا.

آج ایک کلاس فیلو کی سالگرہ ہے ہم دونوں انوائیٹڈ ہیں. پلیز ماما اجازت دے دیں....کچھ دنوں کے بعد ہم نے پاکستان چلے جانا ہے. عروج نے اس کی التجا بھری نگاہوں کو دیکھا اور کہا.

اگلے ہفتے ہم سب پاکستان جا رہے ہیں....لیکن اجازت تو دے دیتی ہوں....یہ وعدہ کرو....کہ اپنی عزت کی حفاظت کریں گی تو میں اجازت دے دوں

گی. دیکھو بیٹا ہم مسلمان ہیں.....جو قدریں ہمارے اباؤ اجداد کی ہیں ان پر ہمیں چلنا پڑتا ہے.....یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی.....شادی سے پہلے گھوم پھر کر جب ان کا جی بھر جاتا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں. مسلمان لڑکیاں تو ان کے ساتھ چل ہی نہیں سکتیں.....لیکن ہمارے گھرانے کے لڑکے اپنے بیوی کی عزت کی حفاظت کرتے ہیں.....قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتے ہیں. تمہارے پاپا کے گھرانہ بڑا عزت دار ہے.....ہر کوئی ان کی تعریف کرتا ہے.

اچھا ماما.....آپ نے اتنی لمبی تمہید باندھ دی ہے. آج پاپا کچھ کہیں تو ان کو سنبھال لینا ہم جلدی آجائیں گی.

عروج اور ماریہ اچھی طرح تیار ہوئیں.....اور وہ ٹیوب سٹیشن تک پیدل چلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہی تھیں. روزینہ نے ماریہ سے کہا.

راحیل اور شہزاد واقعی بہت سلجھے ہوئے لڑکے ہیں.

''تو پھر تم شادی کر لینا''.

''میں.....مگر تمہیں کیا اعتراض ہے''.

اعتراض ہے.....وہ لوگ گھٹے ہوئے ماحول کے ہیں. یہاں ہر طرح کی آزادی ہے.....کوئی انٹرفیر (Interfere) نہیں کرتا. وہاں باہر نکلتے وقت اجازت لینی پڑتی ہے.

''یہاں بھی ماما پاپا کو بتانا پڑتا ہے.....ہم مسلمان ہیں''.

بس طے پایا دونوں میں جو اچھا لگے اس سے شادی کر لینا.

''اور تم''

میں نے ڈیوڈ سے وعدہ کر لیا ہے. وہ اکثر کلب میں انوائیٹ کرتا تھا مگر پاپا کے ڈر سے کبھی نہیں جاتی تھی.

اب میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کی پارٹی میں جا کر دیکھتی ہوں کہ ان کی نجی زندگی کیسی ہے.....پھر والدین کو اس کو بارے میں بتاؤں گی.

روزینہ اس کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی تھی.....وہ ٹیوب سٹیشن پر پہنچ کر اور جلد ہی متعلقہ کلب میں داخل ہو گئیں.....بڑا سا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا. بڑے بڑے شینڈ لیئر لگے تھے.....لڑکیاں عریاں لباس پہنی لڑکوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کر رہی تھیں.....وہاں ویٹر وسکی، وائن اور بیئر سے سب کی تواظع کر رہے تھے..... یورپین، مسلمان لڑکیاں اور ہندو لڑکیاں بلا جھجک شراب پی رہی تھیں. ڈیوڈ نے ماریہ کو دیکھا تو بھاگتا ہوا آیا.....شراب میں اتنا دھت تھا کہ اس کے گلے لگنا چاہتا تھا.....ماریہ نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا.

''تم نے وسکی پی ہے''.

یار آج خوشی کا دن ہے.....تم بھی پیو اور روزینہ کو بھی آفر کرو.

ایک دم سے اندر سے سوئی ہوئی مشرقی لڑکی جاگ اٹھی.....ہم مسلمان ہیں.

''آؤ.....ڈانس کرتے ہیں''.

اچھا ڈانس نہیں کروں گی.....پھر آؤ وہاں دو کرسیاں خالی ہیں وہاں بیٹھ جاؤ.....تم نے کبھی آن کر پارٹی نہیں جوائن کی تھی نا! اس لئے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے.....جلد ہی عادی ہو جاؤ گی. اچھا آپ دونوں وائن پی لو.....وہ صحت کیلئے بہت اچھی ہے.

دیکھو ڈیوڈ تمہارے کہنے پر میں آگئی ہوں.....کیا شادی کے بعد بھی اسی طرح پیو گے.

''ہاں.....یہ نورمل ہے.....اگر ہم نہیں پئیں گے تو ہمیں آب نارمل (abnormal) سمجھا جائے گا''.

ماریہ نے غصے سے کہا.

لیکن ہم نے نہیں کچھ پینا.....وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں.....یہ وہی لڑکے اور لڑکیاں ان کے کلاس فیلو تھے.

ایک گھنٹہ وہ لوگ خوب شراب پیتے رہے اور ساتھ ڈانس کرتے رہے.....پھر شینڈلر کی روشنی میں کیک کٹا اور Happy Birthday کے نعرے گونجے اور بھرپور تالیاں گونجیں پھر ہر کوئی اپنے اپنے پارٹنر کے ساتھ اوپر کی منزل میں جانے لگا.....روزینہ اور ماریہ حیران تھیں پھر ڈیوڈ آیا اور کہنے لگا ماریہ آؤ اوپر چلتے ہیں. میں نے کمرہ بک کروایا ہے.....زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے. روزینہ کیلئے بھی ایک پارٹنر کا انتخاب کرتا ہوں.....پھر ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر اوپر جانے لگا. ماریہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور بڑے زور سے دھکا دیا وہ لڑکھڑاتا ہوا بہت دور زمین پر گر گیا.....سب لڑکے لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئے.

پھر ماریہ غصے سے روزینہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی.....نہ جانے کس طرح دونوں گھر واپس آئیں.....ماریہ کا رو رو کر برا حال تھا. اور روزینہ سے کہہ رہی تھی کہ اگر آج میں نہ آتی تو نہ جانے شادی کے بعد میرا کیا حال ہوتا.

اور اس نے ایسی محفلوں میں لے جا کر میری زندگی برباد کر دینی تھی. وہ بہن کے ساتھ اپنا غم شیئر کر رہی تھی. روزینہ نے کہا..... میں جانتی تھی یہ لوگ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے.....ان کا کلچر بہت فرق ہے.

صبح ناشتہ پر سلمان نے پوچھا.

آپ لوگوں نے تیاری کر لی ہے.....ماریہ خاموش تھی تو روزینہ نے جواب دیا.....تیاری ایک دن میں ہو جائے گی. ماریہ تم بھی کچھ بولو.

جی پاپا ہو جائے گی.

دیکھو اگر لڑکے پسند نہ آئے تو میں زبردستی نہیں کروں گا. ماریہ نے باپ کی طرف دیکھا.....اداسی سے کہا..... پاپا اگر آپ کو پسند آئے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں.....اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی.

عروج.....کھڑکی میں کھڑی آسمان میں پھیلی شفق کو انجوائے کرتے ہوئے سوچ رہی تھی. اتنے سال لندن میں بیت گئے.....اللہ نے ہماری کتنی مدد کی کہ بچیاں پاکستان میں شادی کرنے کیلئے راضی ہو گئیں.

اپنا دیس.....اپنا ہی ہوتا ہے..... یہاں تو ہماری پہچان ہی نہیں.

افسانہ

خاموش لمحے

لبنیٰ صفدر

شہر کی پرانی گلیوں میں وقت ایک دھیمی، نرم دھار کی مانند بہتا تھا۔ ہر پتھریلی راہ، ہر ٹوٹا ہوا مکان، اور ہر سنسان درخت ایک خاموش کہانی سناتا تھا۔ گلیوں کی آہٹ، ہوا کے ہلکے جھونکے، اور دور سے پرندوں کی پروں کی آوازیں، سب اپنی ایک منفرد داستان لیے ہوئے تھیں۔ یہ شہر عدنان کا مسکن تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو دن بھر ہر چیز کو خاموشی سے محسوس کرتا، ہر لمحے کی اہمیت کو محسوس کرتا اور شام کے سناٹے میں کتابوں اور یادوں کی دنیا میں غرق ہو جاتا۔

عدنان کے لیے یہ شہر محض مکانوں اور راستوں کا مجموعہ نہیں تھا۔ ہر شخص، ہر منظر، اور ہر لمحہ اس کے لیے ایک منفرد داستان کی مانند تھا۔ مگر یہ کہانیاں عام لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتی تھیں۔ اس کی سب سے پرانی دوست، حنا، اسی شہر کی گلیوں میں رہتی تھی۔ دونوں کے تعلقات میں ایک خاموش فاصلہ موجود تھا، ایک ایسا رشتہ جو زیادہ باتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ خاموش نظروں، ان کہے اشاروں اور مختصر ملاقاتوں سے جڑا ہوا تھا۔

ایک دن، عدنان نے حنا کے ساتھ شہر کی پرانی لائبریری کا رخ کیا۔ یہ لائبریری، جو کبھی روشنی، رونق اور گفتگو سے بھری رہتی تھی، اب صرف کتابوں کی دھول کی خوشبو سے معمور تھی۔ حنا نے ایک پرانی کتاب اٹھائی جس کے زرد صفحات وقت کی چھاپ سے بھرے ہوئے تھے۔ عدنان نے محسوس کیا کہ یہ کتاب محض لفظوں کا مجموعہ نہیں بلکہ گزرے ہوئے لمحوں اور یادوں کی عکاسی کر رہی تھی۔ چند جملے جو دونوں نے پڑھے، ان کے درمیان خاموشی کی زبان بن گئے، ایک ایسی زبان جو نہ بولتی تھی، نہ ٹوٹتی، مگر ہر احساس میں موجود تھی۔

بازار کی طرف جاتے ہوئے، ان کی نظر ایک بوڑھے شخص پر پڑی، جو روزانہ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر کاغذ پر کچھ لکھتا اور پھر مڑ کر دیکھتا تھا۔ حنا نے کہا، "یہ شخص ہر دن اپنی خاموشی میں اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہے۔" عدنان نے سوچا کہ واقعی، ہر انسان ایک الگ داستان لیے ہوئے ہے، اور ہم محض اس شہر کی گونج میں اپنا عکس تلاش کر رہے ہیں۔

رات کے سناٹے میں، دونوں پرانے پارک کے ایک سنسان کونے میں جا بیٹھے۔ پرانے درخت کی شاخیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہل رہی تھیں، اور زمین پر پڑے ٹوٹے پتوں کی آواز ایک خاموش موسیقی کی مانند سنائی دے رہی تھی۔ حنا نے کہا، "کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ شہر ہم پر کتنا اثر ڈالتا ہے؟ ہر سایہ، ہر آواز، ہر گزرتا انسان ہمارے اندر کچھ بدل دیتا ہے۔" عدنان خاموش رہا، لیکن اس کی نظر ہر لفظ کو دل میں بسائے ہوئے تھی۔ آخرکار اس نے کہا، "شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کی خاموشی کبھی خالی نہیں لگتی۔"

چند دن بعد، ایک غیر متوقع واقعہ نے ان کے تعلقات کو نئی جہت دی۔ بازار میں ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آیا، اور ایک ٹھیلے والا حنا کے قریب گر گیا۔ عدنان نے فوراً اسے بچایا۔ یہ لمحہ ان کے درمیان خاموش رشتے کی گہرائی کو واضح کر گیا۔ پہلی بار دونوں نے محسوس کیا کہ جو فاصلہ ان کے درمیان تھا، وہ صرف زمانے اور پرانی عادات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، مگر رشتہ ہمیشہ موجود رہا، بس چھپی ہوئی حالت میں۔

اس کے بعد، عدنان اور حنا شہر کے ہر گوشے میں گھومنے لگے۔ وہ پرانے تالابوں کے کنارے بیٹھتے، چ باغوں میں درختوں کی چھاؤں میں کئی گھنٹے گزارتے، اور پرانے مکانوں کے صحن میں خاموشی کے لمحے بانٹتے۔ ہر منظر، ہر آواز، ہر لمحہ ان کے تعلقات میں ایک نئی پرت کھول رہا تھا۔ شہر کی گونج، پرندوں کی پرواز، درختوں کی سرسراہٹ، اور ہوا کے ہلکے جھونکے، سب ان کے درمیان ایک خاموش زبان کی مانند تھے، ایک ایسا پل جو نہ بول سکتا تھا، نہ ٹوٹ سکتا تھا، مگر ہر احساس میں موجود تھا۔

وقت کے ساتھ، عدنان اور حنا نے محسوس کیا کہ شہر کے ہر گوشے میں ایک راز چھپا ہوا ہے۔ پرانی عمارتوں کی دیواریں، چھوٹی گلیوں کے موڑ، اور سنسان باغ کے ہر درخت کے نیچے چھپی کہانیاں، سب ان کے دل میں ایک نئی بصیرت پیدا کر رہی تھیں۔ حنا نے کہا، "شہر کے ہر گوشے میں چھپی ہوئی کہانیاں ہمیں ہماری زندگی کے ان لمحوں سے جوڑتی ہیں جو ہم اکثر بھول جاتے ہیں۔" عدنان نے خاموشی سے سر ہلایا اور محسوس کیا کہ واقعی، شہر کی خاموشی میں ایک گہرا سبق چھپا ہوا ہے، جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ایک شام، دونوں پرانے پل کے کنارے بیٹھے تھے۔ پانی کی ہلکی ہلچل، درختوں کے پتوں میں ہوا کی سرسراہٹ، اور دور کہیں بچوں کی ہنسی، سب ان کے درمیان ایک نرمی اور سکون کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ حنا نے کہا، "ہم اکثر یہ سوچتے ہیں کہ زندگی ہمارے قابو میں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر لمحے

CS CamScanner

اس وقت اور ماحول کی گردش کے تابع ہیں۔ "عدنان نے خاموشی سے اس کی بات سنی، اور دل ہی دل میں محسوس کیا کہ ہر لمحہ اپنی ایک چھپی حقیقت لیے ہوئے ہے، اور وہ دونوں محض اس حقیقت کے ناظر اور حصہ ہیں۔

رات کے وقت، جب شہر کی روشنی مدھم ہوگئی اور ہر آواز غائب ہوگئی، عدنان اور حنا کھڑکی کے پاس بیٹھے۔ کسی لفظ کی ضرورت نہیں تھی، ہر لمحہ اپنی ہی زبان میں محسوس کیا جا رہا تھا۔ شہر کے خاموش لمحے ان کے درمیان ایک پل بن گئے، ایک ایسا رشتہ جو نہ بول سکتا تھا، نہ ٹوٹ سکتا تھا، مگر ہر جذبے میں جڑ گیا۔ وہ ایک دوسرے کی موجودگی میں، بغیر کسی گفتگو کے، ہر لمحے کو محسوس کر رہے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور شہر کی خاموش گلیاں، پرانے مکان، اور سنسان پارک ان کی کہانی کے ایک لازوال حصے بن گئے۔ عدنان اور حنا کی زندگی میں ہر لمحہ ایک نئے رنگ، ایک نئے احساس، اور ایک نئی کہانی کو لے کر آتا۔ نہ کوئی سبق دینا تھا، نہ کوئی مقصد حاصل کرنا، بس انسان اور شہر کے درمیان ایک غیر مرئی تعلق، جو ہر لمحے کو ایک منفرد اور لازوال تجربہ بنا دیتا۔

یوں عدنان اور حنا کی کہانی شہر کی خاموش گلیوں، وقت کی دھیمی گزرگاہوں، اور ہر چھوٹے لمحے میں چھپی حقیقت کے ساتھ جڑ گئی۔ ہر لمحہ، ہر منظر، اور ہر سرسراہٹ ان کے تعلقات میں ایک نیا باب کھولتی، اور شہر کی خاموشی ایک زبان کی طرح ان کے دلوں میں رہتی۔ وہ جان گئے کہ حقیقت میں خاموش لمحے سب سے زیادہ بولتے ہیں، اور ہر چھپی ہوئی کہانی انسان کی زندگی کو معنی دیتی ہے۔

سلطان ناصر/اسلام آباد

لفظوں کے اُس پار مجھے لے جا سکتے ہو
تم چاہو تو ساری بات بتا سکتے ہو
بیلوں کی زنجیر بڑی ہے دروازے پر
لیکن تم خوشبو ہو، اندر آ سکتے ہو
رخساروں سے اُڑتا رنگ پکڑ پاؤ گے؟
کوشش کر لو، کتنا راز چھپا سکتے ہو
جس کو اپنے سائے سے وحشت ہوتی ہو
کیا تم ایسے شخص کے ساتھ نبھا سکتے ہو؟
میں اک شب میں اتنے دیپ جلا سکتا ہوں
جتنے ساری عمر میں آپ بجھا سکتے ہو

✦✦✦

احتشام حسن

دیا ملا ہے وہاں ایک شش جہات جہاں
جگہ بنائی ہٹا کر تجاوزات جہاں
تغیرات کی زد میں گزار دی ہے حیات
کہیں ثبات میں آیا نہ بے ثبات جہاں
بتا رہا تھا وہ اک موڑ سے ذرا پہلے
یہ وہ مقام ہے ہوتے ہیں حادثات جہاں
اُتر رہی ہے بصارت کے زاویوں میں دھنک
اور اک جہاں میں نظر آ رہے ہیں سات جہاں
یہ لازمی نہیں اہرامِ مصر اُگ آئیں
کسی نے دفن کیے ہوں نوادرات جہاں
وہاں کسی کے بدلنے پہ حیرتیں کیسی
مزاج روز بدلتی ہو کائنات جہاں
اسی دیار کے بے بس مکین ہم بھی ہیں
نظر کے سامنے پلتے ہیں سانحات جہاں
ہم اس مقام پہ ہو کر وہاں نہیں ہوتے
خیالِ یار کی ہوتی ہے واردات جہاں
گئے تھے ہم وہاں دانستہ ہارنے کو حسن
ہمارے خوف سے اُلٹی گئی بساط جہاں

✦✦✦

اسحاق وردگ/پشاور

پری جمال کبھی دل کے پاس آئی نہیں
مجھے تو ایک محبت بھی راس آئی نہیں

مجھے نصیب کا اک فیصلہ بدلنا تھا
مگر قریب ستارہ شناس آئی نہیں

ہر ایک لہر بگولوں کی ہم خیال ہوئی
ہوائے دشت سمندر کو راس آئی نہیں

فلک پہ جھومتی رہتی ہے بے نیازی میں
زمین پر وہ محبت شناس آئی نہیں

کئی قبیلوں میں اس کی کہانی زندہ ہے
وہ جل پری جو کناروں کے پاس آئی نہیں

پڑھا رہی ہے وہ غالب کی دل نشیں غزلیں
ہمارے حصے میں جس کی کلاس آئی نہیں

ہمارے عشق کا دریا تو رائگاں ہی گیا
کسی کے دل میں محبت کی پیاس آئی نہیں

وہ شام درد تھی جس میں ہمیں بچھڑنا تھا
میں رو رہا تھا مگر وہ اداس آئی نہیں

حسین یاد کی اک موجِ دل نشیں اسحاق
ازل سے دل کے جزیرے کے پاس آئی نہیں

✦✦✦

افسانہ

چوراہے کی عورت

ساجدہ امیر

یمن کے بادشاہ سلامت کی طبیعت میں کوئی سدھار نہ آ رہا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے مختلف طبیبوں اور حکیموں کو بلوایا گیا سب نے اپنی بھرپور کوشش کی لیکن سب بے سود۔ پورا یمن غم کے سائے میں ڈوبا ہوا تھا۔

سلطان شاہ ایک رحم دل انسان تھے۔ ان کے دل میں اپنی قوم کے لیے محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان شاہ نہ صرف یمن کے لوگوں کے لیے بلکہ آس پاس کے علاقہ جات کے لیے بھی قابلِ محبت تھے۔ دور دراز سے کوئی مسافر یا بادشاہ یمن کی سیر کے لیے آتے تو بادشاہ سلامت ان کا استقبال نہایت دھوم دھام سے کرتے۔ بادشاہ سلامت کی صرف ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام تھا شہزادی یمنیٰ، سلطان شاہ کو یمن سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نام بھی یمنیٰ رکھ دیا۔ سلطان شاہ کا کوئی بیٹا نہ تھا اور یہی فکر سلطان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی کہ میرے بعد میری قوم کی خدمت پتا نہیں کون اور کیسے کرے گا۔

شہزادی یمنیٰ ایک خوبصورت اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ یمنیٰ کے خوبصورت لمبے بال نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے۔ یمنیٰ کی خوبصورتی کے چرچے آس پاس کے تمام سلطنت میں تھے ہر شہزادہ دل میں یمنیٰ کے خواب سجائے بیٹھا تھا۔ وہ اکثر سلطان شاہ کو اداس دیکھتی تو کہتی:

ابا حضور آپ کی اگلی گدی نشین میں بنوں گی۔۔"

اور سلطان اس بات پر ہنس دیتے اور دل ہی دل میں کہتے:

"یمنیٰ! بیٹیاں باپ کی گدی نشین بنتی تو بیٹے کی تخلیق ہی نہ ہوتی، بیٹیاں تو آنگن کا پھول ہوتی ہیں جنہیں ایک نا ایک دن زمین سے اکھاڑ کر گملے (رخصت کرنا پڑتا ہے) میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ کوئی راہگیر ان کو کچل نہ دے۔"

دن گزرتے گئے، اور اچانک بادشاہ سلامت بیمار پڑ گئے۔ سلطان شاہ کی طبیعت دن بدن تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان شاہ کو کوڑھی کی بیماری نے آ پکڑا۔ شاہی محل میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ موت تاک لگائے بیٹھی ہو۔

"بادشاہ سلامت عراق کے شہر میں ایک جانا مانا طبیب رہتا ہے۔ کوڑھی کی بیماری کے بہت سے مریض اس کے علاج سے آج خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔"

شاہی محل کا وزیر سر جھکائے بادشاہ سلامت کے بستر کے پاس کھڑے ان کو طبیب کا بتا رہا تھا۔

"وزیر! آپ جلد از جلد اس طبیب کو میرے سامنے لے کر آئیں اگر کل تک وہ یہاں نہ ہوئے تو آپ کا سر دھڑ سے الگ کر دیا جائے گا۔"

پریشانی کے باعث ملکہ عالیہ نے سلطان شاہ کے جواب سے پہلے اپنا حکم سنا دیا۔

وزیر اثبات میں سر جھکائے عراق کی طرف روانہ ہوگیا۔

"کوئی ایسی عورت جس نے اپنے محرم کے علاوہ کسی کو ہاتھ نہ لگایا ہو نہ ہی خود کو لگانے دیے ہو اور دل بھر کر کسی غیر مرد کو دیکھا بھی نہ ہو، اگر وہ عورت بادشاہ سلامت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو یہ بیماری کم ہو جائے گی تب ہم ادویات کے ذریعے اسے ختم کر سکتے ہیں۔"

عراق کے طبیب نے سلطان شاہ کی حالت دیکھنے کے بعد اس بیماری کا علاج آخر ڈھونڈ ہی لیا۔

"کوئی ایسی عورت جس نے اپنے محرم کے علاوہ نہ دل بھر کے کسی کو دیکھا ہو، نہ ہی ہاتھ لگایا ہو وہ بادشاہ سلامت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو اس کام کے عوض اسے سو دینار اور سونا چاندی جیسے زیورات سے نوازا جائے گا۔"

پورے یمن میں بادشاہ کے سپاہی اعلان کر رہے تھے، لیکن دو دن تک کوئی بھی نتیجہ سامنے نہ آیا۔

اچانک ہی بادشاہ سلامت نے شہزادی یمنیٰ کو اپنی آرام گاہ میں آنے کا سندیسہ بھیجا۔ یمنیٰ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی آئی۔

"ابا حضور! مجھے معاف کر دیں میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی بیماری کا علاج کروں۔"

یمنیٰ بادشاہ سلامت کے پاؤں میں گر کر رو رہی تھی۔

شہزادی یمنیٰ، یمن کے ایک شہزادے سے محبت کرتی تھی اور روز ہی سیر کے بہانے اس سے ملنے جاتی تھی۔ یہ سن کر بادشاہ سلامت افسردہ ہوگئے کہ ان کی بیٹی ہی ان کے کام نہ آئی۔

وقت گزرتا گیا چار دن تک پورے یمن میں اعلان ہوتا رہا لیکن کہیں سے کوئی خوشخبری نہ ملی۔

"اگر تمہیں لگتا ہے ساکو کہ تم نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا نہ کسی کو دیکھا نہ ہی ہاتھ لگایا تو میں تمہیں بادشاہ سلامت کے علاج کے لیے نہیں روکوں گا۔"

یمن میں موجود ایک عورت جو در در پھرتی تھی لوگ اسے "چوراہے کی عورت" کے نام سے بلاتے تھے۔ جب اسے اعلان کا پتا چلا تو اس نے اپنے شوہر سے اجازت لی کہ وہ بادشاہ سلامت کے علاج کے

لیے جانا چاہتی ہے۔

یمن میں یہ بات پھیل گئی تو سب لوگ ہنسنے لگ گئے کہ جس عورت کو سارا دن در در پھرنے سے فرصت نہیں ملتی وہی بادشاہ سلامت کا علاج کرے گی۔

اگلے دن ساکو شاہی محل پہنچ گئی اور اپنے متعلق سب کچھ بتایا سب نے حیرانگی سے اسے دیکھا لیکن بادشاہ کا حکم تھا" اسے اجازت ہے کہ وہ میرا علاج کرے۔"

سلطان شاہ کا دل ٹوٹ چکا تھا جب اس نے یمنیٰ کی داستاں اس کے منہ زبانی سنی۔

ساکو نے طبیب کے بتائے طریقے کے مطابق اپنے ہاتھ پر کچھ لگایا اور وہی ہاتھ سلطان شاہ کے کندھے پر رکھ دیا کچھ دیر رکھنے کے بعد طبیب نے اسے ہاتھ اٹھانے کا کہہ دیا۔ایسے ہی یہ عمل دو تین روز تک ہوتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ سلامت کی صحت یابی کی خبریں پورے یمن میں پھیل گئیں۔

کچھ ہفتوں بعد بادشاہ سلامت اپنے تخت پر بیٹھے اپنی پرجا سے بات کر رہے تھے۔بادشاہ سلامت نے سب کے سامنے ساکو کو وعدے کے مطابق انعامات سے نوازا اور کہا:

لازم نہیں ہوتا چوراہے پر چلنے والی ہر عورت بدچلن ہو،کبھی کبھی مجبوریاں بھی انسان سے ایسے کام کروا جاتی ہیں جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔اسلام نے عورت کا رتبہ بلند رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں میری سلطنت میں بھی عورت کو وہی مقام ملے۔"

یہ سن کر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

محل کو دلہن کی طرح سجایا گیا اور شہزادی یمنیٰ کی شادی یمن کے شہزادے سکندر سے کرا کر اسے خوشی خوشی سلطان شاہ نے رخصت کیا۔

سُمبُل معراج/امریکا

محبت یوں نہیں ہوتی!

کہ جس کو کچھ ذہنوں سے بھی ہم تم جان لیتے ہیں
کسی بے نام جزبے کو محبت مان لیتے ہیں
محبت ٹوٹنے اور درد کو سہنے کی عادت ہے
ستم یہ ہے کہ کہتے ہیں یہ بس چُپ کی عبارت ہے
محبت الجھی سلجھی خواہشوں سے کچھ پَرے ہٹ کر
خودی کو مار دینا ہے
محبت چھوڑنا ہے ہر تمنا،اصل حاصل ہار دینا ہے
محبت یوں بھی ہوتی ہے!
کبھی سارے اصولِ دل یہ خود ہی توڑ دیتی ہے
ذرا نظرِ عنایت ہو،توقع جوڑ لیتی ہے
اگر تم شرک کر بیٹھو تو تنہا چھوڑ دیتی ہے
یہ موجِ وحدتِ حق ہے،سفینہ موڑ دیتی ہے
محبت اِک صحیفہ ہے
یہ طالب کے دلِ مضطر میں
جاری اِک وظیفہ ہے
محبت میں اُسے پانا یا کھونا کچھ نہیں رہتا
جنونِ بندگی ہے یہ،یہ چھونے کو نہیں کہتی
محبت اِک ازل کی روح کا آدھا سا حصّہ ہے
ابد کا آدھا حصّہ ڈھونڈنے کا سارا قصہ ہے
کہیں وہ جلوہ گاہِ ناز میں چھپتی سَرَکتی ہے
محبت عرش سے جھک کر ہماری راہ تکتی ہے
محبت یوں ہی ہوتی ہے۔۔۔۔

سُمبُل معراج/امریکا

عشق کے سارے مراحل پار سمجھو کر گیا
موت سے پہلے یہاں پر آدمی جو مر گیا

خالی لے کے گھومتے پھرتے تھے ویرانوں میں ہم
کاسئہ دل کو ہمارے اک سوالی بھر گیا

کیا عجب ہے سلسلہ شوقِ نصابِ عشق کا
ڈھونڈنے نکلا جو خوشیاں لے کے دامن تر گیا

کیا سُنائیں حالِ مقتل کیا کہیں کیا کیا ہوا
یاں بچایا دل وہاں کاندھے سے اپنے سَر گیا

کچھ چلا بامِ تجلی کچھ وہیں پر رہ گیا
جو ترے در سے گیا، وہ کب مکمل گھر گیا

احمد عبداللہ

منزل مجھے ملی کسی مٹتے سراغ سے
سورج تلاش کرلیا بجھتے چراغ سے

دھبوں کے باوجود بڑھے پگڑیوں کے دام
آنچل کا بھاؤ گر گیا بس ایک داغ سے

چھاؤں تو دے سکوں گا مگر پھول پھل نہیں
صحرا کا پیڑ ہوں مجھے جانے دے باغ سے

یہ میں ہی جانتا ہوں کہ دل کی منڈیر پر
کس طرح پیش آئی ہوائیں چراغ سے

اک گرم جوش دل اسے لے کر چلا گیا
ہم کام لیتے رہ گئے ٹھنڈے دماغ سے

CS CamScanner

پھر کیا ہوگا؟

عامر بن علی/ جاپان

ایک جاپانی سائنسدان ڈاکٹر ماسارو ایموتو نے 1994ء میں ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا۔ یہ حیران کن تھیوری تھی کہ ہمارے منہ سے بولے ہوئے الفاظ کے دنیا پر مادی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ الفاظ تو غیر مرئی اور غیر مادی ہوتے ہیں، بھلا ان کا دنیا پر مادی اثر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر ماسارو ایک تجربہ سامنے لا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ انسانی جسم کا 70% حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ مذکورہ سائنسدان نے پانی کی ایک ٹونٹی کھولی اور اس سے ایک برتن میں پانی بھر کر لے آیا۔ اس برتن کو منہ کے قریب کر کے اس نے کہا، میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم بہت اچھے ہو، تمہاری ہر چیز بہت خوبصورت ہے اور اسی طرح کی دیگر مثبت باتیں کر کے اس کا ڈھکن بند کر کے فریزر میں رکھ دیا۔ پھر پانی کی اسی ٹونٹی سے اس نے بالکل ویسا ہی برتن بھرا اور منہ کے قریب کر کے چلایا کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں، تم بہت برے ہو، تمہاری ذات سے متعلق ہر بات ہی بری ہے، غرض اسی طرح کی منفی باتیں کر کے اس برتن کا ڈھکن بھی بند کر دیا اور نشان لگا کر اسی فریزر میں برف جمنے کے لئے رکھ دیا جہاں پہلا برتن رکھا گیا تھا۔

چند گھنٹوں کے بعد جب دونوں برتنوں میں پڑا پانی برف بن کر جم گیا تو انہیں فریزر سے باہر نکالا گیا۔ برف کو برتنوں سے نکال کر خوردبین کے نیچے مطالعے کے لئے رکھا گیا تو نتائج چونکا دینے والے تھے۔ جس پانی پر محبت بھرے بول اور میٹھی باتیں کی گئی تھیں اس کے اندر بلاک بڑی خوبصورتی اور ترتیب سے پائے گئے، جبکہ جس برتن کے پانی پر نفرت بھری باتیں، غصے اور برہمی کا اظہار کیا گیا اس کے پانی نے جو برف بنائی اس کے اندر آڑھی ترچھی، بے ترتیب شکلیں پائی گئیں۔ کوئی ترتیب اور خوبصورتی جو پہلے برتن کی برف میں نظر آئی، دوسرے برتن میں اس کے الٹ معاملہ تھا۔ اس تجربے کے نتائج تو آپ بخوبی اخذ کر سکتے ہیں۔

اس طویل تمہید کی وجہ مقبول برطانوی جریدے اکانومسٹ کے حالیہ تازہ شمارے میں شائع ہونے والا پاکستان کے متعلق مفصل مضمون ہے۔ مذکورہ مضمون میں پاکستان میں کان کنی کے حوالے سے پائے جانے والے امکانات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جو کہ اس معتبر جریدے کی نظر میں امریکہ اور صدر ٹرمپ کی پاکستان میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سب سے بنیادی سبب ہے۔ تانبے، سونے اور کمیاب معدنیات کی قیمت کے متعلق 150 ارب ڈالر کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ وائٹ ہاؤس کی طرف سے جاری کردہ وہ تصویر بھی شامل اشاعت ہے جس میں فیلڈ مارشل سید عاصم منیر امریکی صدر کو تحفتاً پتھر کے ٹکڑے پیش کر رہے ہیں، جو کہ غالباً پاکستانی کانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ سب بہت خوبصورت اور حوصلہ افزاء باتیں ہیں، پاکستان کے روشن مستقبل کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ماسارو کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے ان ہی خوش آئند باتوں کے ساتھ کالم تمام کر دیا جائے جس سے آپ کے ذہن پر بھی مثبت اثرات مرتب ہونے کا قوی امکان ہے۔ دوسری صورت ذرا تلخ ہے، شاید کڑوی کسیلی باتیں آپ کو پسند نہ بھی آئیں مگر پھر بھی تلخ نوائی سے خود کو باز نہ رکھ سکوں گا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ نظام مملکت فقط میٹھے بول اور حرف تسلی سے نہیں چلایا جا سکتا۔ جاپانی سائنسدان کی تحقیق اور تھیوری اپنی جگہ معتبر ہے مگر مؤدبانہ گزارش یوں ہے کہ ریاستوں کا بندوبست حقیقت پسندی پر مبنی ہوتا ہے۔ کامیاب ریاست کا نظام زمینی حقائق کو ملحوظ خاطر رکھ کر انتظام حکومت چلانے سے ہی قائم رہ سکتا ہے۔

زمینی حقیقت یہ ہے کہ 25 کروڑ کے ملک کی معاشی حالت بدلنے کا طریقہ 25 لاکھ آبادی کے حامل ملک سے مختلف ہوگا۔ پاکستان میں معدنیات اور تیل کے ذخائر کی خبریں مجھے بھی بہت پسند آتی ہیں، سننے میں کانوں کو بہت اچھا لگتا ہے کہ اتنے ارب ڈالر کا ایندھن اور اتنے کھرب ڈالر کے معدنیات ہمارے قدموں کی زمین کے نیچے دفن پڑے خزینے کی صورت ہماری تقدیر بدلنے کے منتظر ہیں۔ ہمارے ملک کے تمام بیرونی قرضے اتارنے کے بعد بھی یہ ہمارے حالات تبدیل کرنے کے لئے کافی وشافی ہیں۔ اگر وطن عزیز کی آبادی بھی چند لاکھ افراد پر مشتمل ہوتی تو یقیناً ایسی دریافت ہمارے دیس کا چہرہ بدل دیتی، لوگوں کی زندگیوں میں ایک انقلابی تبدیلی لے کر آجاتی، مگر ہمارا ملک 25 کروڑ کی آبادی پر مشتمل ہے۔ اتنے بڑے ملک کی معیشت اور بحالی و ترقی کسی بھی معدنی دولت کے بل بوتے پر کایا کلپ ہونا آسان نہیں ہے۔ کچھ پڑھنے والوں کو میری باتیں شاید زیادہ پسند نہ آئیں مگر عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ عربوں کی طرح فارغ بیٹھ کر تیل کی کمائی پر زندگی گزارنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ میں قنوطیت پسند نہیں، حقیقت پسندی کی طرف راغب ہونے کی بات کر رہا ہوں۔

ہمارے ملک کا مستقبل روشن ہے۔ یہ میرا تجزیہ ہی نہیں ایمان بھی ہے، مگر اس مقصد کے حصول کے لئے اچھی معاشی حکمت عملی درکار ہے، پھر اس کا تسلسل ناگزیر ہے کہ دیرپا معاشی استحکام لے کر آئے۔ قطر پر چند سال پہلے سعودی عرب نے اقتصادی پابندیاں لگائیں تو انہوں نے قطر ایئر ویز کے جہاز بھیج کر آسٹریلیا سے فوری طور پر گائیں درآمد کر لیں، تاکہ ملک میں دودھ اور ڈیری مصنوعات کی قلت پیدا نہ ہو جائے۔ اس دلیرانہ معاشی اقدام کی وجہ فقط قطر کی تیل اور گیس کی آمدن ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی کل آبادی 30 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، جس میں سے مقامی لوگ فقط دس فیصد ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے کانوں سے آشنا یہ مشورہ کہ ہوائی جہاز کے حادثے کی صورت میں ہمیشہ بلیک باکس بچ جاتا ہے، تو پھر جہاز کا بلیک باکس جس مادے سے بنایا جاتا ہے، پورا جہاز ہی اس میٹریل سے کیوں نہیں بنا لیتے؟

بقیہ انٹرویو: منو بھائی

(س) اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں؟

(ج) میری پیدائش 6 فروری 1933 کی ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلرشپ ہوئی۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔ اس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔ میرے دادا امام مسجد تھے لیکن ان کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔ امامت ان کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ ان کا نام میاں غلام حیدر تھا۔ انہوں نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ ان کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں۔ جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے منو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری ایک نظم چھاپی۔

(س) بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟

(ج) میری پیدائش وزیرآباد کی ہے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔ بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتداء کی۔

(س) ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگار ٹی وی ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصہ سے آپ نے ٹی وی کے لئے ڈرامہ نہیں لکھا اس کی کوئی خاص وجہ؟

(ج) موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے، جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔ اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔ وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں جیو کے لئے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا۔ جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔

(س) پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟

(ج) میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے۔ اس شاعری پر مجھے پرائیڈ آف پرفارمنس ملا ہے۔ میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نہیں آئی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

(س) شاعری کے لئے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

(ج) پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لئے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔ میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو۔''

(س) شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کونسا تعارف زیادہ پسند ہے؟

(ج) ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں میں بہتر انداز میں اظہار کرسکتا ہوں۔

(س) ایک کالم نگار کے لئے غیر جانبدار ہونا کس حد تک ضروری ہے؟

(ج) میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لئے غیر جانبداری ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کررہا ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہئے۔ جو چور کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے ناانصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ کالم نگار کو چاہئے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

(س) آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

(ج) آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

(س) اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

(ج) جو بھی انسان کی محرومی، آرزوؤں، خواہشوں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو، میرے خیال میں ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

(س) پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

(ج) ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں، میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں ہے۔

(س) رمشا کیس کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے؟

(ج) پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء نے حق اور انصاف کی بات کی ہے۔ ایک ایسی بچی کے بارے میں جو کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں یہ کہنا کہ توہین قرآن پاک کی مرتکب ہوئی ہے اپنی جگہ خود ایک ابنارمل رویہ ہے۔ پہلی دفعہ اس کیس میں نظر آرہا ہے کہ جج بغیر کسی دباؤ کے فیصلہ کرسکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیام پاکستان سے پہلے ہم ہندوستان میں خود ایک اقلیت تھے۔ آج ہمیں اقلیتوں کو تنگ کرتے وقت شرم محسوس کرنی چاہیے۔

CamScanner

بقیہ انٹرویو: احمد ندیم رفیع

انہوں نے ان شاعروں کی ایک فہرست بھی بنا کر بھیجی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان سے آئرلینڈ منتقل ہوگیا۔ سن ۲۰۰۰ء میں مجموعہ کلام شائع کروانے کا شوق چرایا۔ ایک مشترکہ دوست کے توسط سے فرحت عباس شاہ سے ملاقات ہوئی۔ پہلا شعری مجموعہ ''آنکھوں میں ستارے رہنے دے'' پبلشر 'شام کے بعد' کے بینر تلے شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی میں مرحوم عدیم ہاشمی، حسین مجروح اور اجمل نیازی مہمانانِ خصوصی تھے۔ عدیم ہاشمی نے ایک نجی محفل میں میری شاعری میں کچھ تکنیکی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔ جس سے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی کتاب شائع کرنے میں کچھ جلدی کر دی ہے جبکہ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ سن ۲۰۰۲ء میں امریکہ منتقل ہوگیا اور تب سے یہیں مقیم ہوں۔ امریکہ آ کر پہلے پانچ سال شاعری سے کنارہ کش رہا۔ انہی دنوں یاہو اور جی میل پر ادبی گروپ بننے شروع ہوئے تو گزرگاہِ خیال گروپ میں کسی نے شامل کر دیا۔ فیصل حنیف اس گروپ کے کرتا دھرتا تھے جو باقاعدگی سے اساتذہ کا کلام شیئر کرتے تھے۔ انہوں نے غالب فہمی کا سلسلہ بھی شروع کیا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ بزمِ اردو قطر سے افتخار راغب طرحی مشاعروں میں شرکت کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ اس طرح میری شاعری کا دوسرا جنم ہوا۔ ایک بار مشکل بحروں میں طبع آزمائی کا شوق چرایا تو مشکل سے مشکل بحر میں غزلیں لکھیں۔ جواب کچھ طویل ہوگیا لیکن کچھ لوگ ایسے نابغۂ روزگار ہوتے ہیں کہ ان سے ایک دن کی ملاقات بھی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ اس لیے ان سب حضرات کا ذکر کرنا اور احسان ماننا ضروری سمجھا۔

ارژنگ: شاعری آپ کی محبوبہ ہے یا وقت گزاری کا ذریعہ؟

احمد ندیم رفیع: میرے نزدیک شاعری کو وقت گزاری بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ایک محبوبہ کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ میں شاعری کو تفریح، آرام یا ذہنی مشغولیت کا ایک ذریعہ بھی سمجھتا ہوں اور ایک زندہ، سانس لینے والے ساتھی کے طور پر بھی دیکھتا ہے جو سننے، سمجھنے اور جذبات کو بانٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ارژنگ: عشق کس بلا کا نام ہے۔ کبھی سامنا ہوا؟

احمد ندیم رفیع: عشق انسانی زندگی میں ایک اہم اور کلیدی جذبہ ہے جو لوگوں کے درمیان گہرے اور معنی خیز روابط کو فروغ دیتا ہے۔ انسان کو اپنے بارے میں، اپنے جذبات اور احساسات کے بارے میں گہرائی سے جاننے کا موقع دیتا ہے، جس سے خودشناسی میں اضافی ہوتا ہے۔ عشق انسان کو بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے جس سے مثبت جذبات کو فروغ ملتا ہے۔ عشق کا تجربہ انسان کو روحانی اور جذباتی طور پر بھی ترقی دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی، شفقت اور بے لوث محبت کا اظہار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جب کوئی محبت کے ساتھ کسی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے تو وہ زندگی کی سختیوں کو زیادہ بہادری اور مضبوطی کے ساتھ سہہ سکتا ہے۔ عشق اکثر تخلیقی اظہار کا ایک زبردست ذریعہ بنتا ہے۔ شاعری، موسیقی، فنون لطیفہ اور ادب میں عشق کے ایسے اظہار یے آئے دن آتے ہیں، جہاں فنکار اپنے جذبات کو تخلیقی طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ ہر انسان عشق کے تجربے سے گزرتا ہے۔ میں بھی گزرا اور اس تجربے نے میرے شاعری پر اثرات بھی چھوڑے ہوں گے۔

ہم فقیروں کو کیا غرض اس سے
کہ خزاں کی ہو یا بہار کی دھوپ

ہم رہِ عشق کے مسافر ہیں
ہم پہ رہتی ہے کوئے یار کی دھوپ

سامنے ہجر یار کا صحرا
کوس در کوس انتظار کی دھوپ

ارژنگ: آپ کے نزدیک اچھی شاعری کی تعریف کیا؟

احمد ندیم رفیع: شاعری ایک جامع فن ہے جو زبان، جذبات، فکر اور موسیقیت کے میل سے تخلیق ہوتی ہے اور یہ قاری یا سامع کو اپنے جادو میں جکڑ لیتی ہے۔ درحقیقت جو شاعری قاری یا سامع کے جذبات کو چھو نہ سکے، کبھی زندہ نہیں رہتی۔ اچھی شاعری، خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، ایک ایسا فن ہے جو زبان کی خوبصورت، اظہار کی گہرائی اور جذبات کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ علامتیں اور تصویری زبان شاعری کو تاثیر بخشتی ہیں۔ (بقیہ اندرونی صفحات پر)

شاعری میں جذباتی گہرائی اور صداقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آفاقی شاعری وہ ہوتی ہے جو مختلف ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب کے درمیان بات چیت اور سمجھ بوجھ کو فروغ دے اور عالمی اور انسانی اقدار کی عکاسی کرے۔ اردو شاعری میں لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب اہم ہوتی ہے۔ اچھی شاعری میں لفظوں کی خوبصورتی اور ان کا معنی خیز استعمال نمایاں ہوتا ہے۔

اک توازن ہے یہ الفاظ و معانی کے بیچ
شاعری نام نہیں قافیہ پیائی کا

ارژنگ: آپ کے شب و روز کے معمولات کیا ہیں۔ اب کے لیے کتنا وقت ملتا ہے؟

احمد ندیم رفیع: شعبۂ طب سے منسلک ہوں جس کی وجہ سے میرے شب و روز پیشہ ورانہ مصروفیات سے جڑے رہتے ہیں۔ شعر و ادب کے لیے وقت ملتا نہیں بلکہ نکالنا پڑتا ہے۔ آرکنساس امریکہ میں رہتے ہوئے بھی یہاں شعر و ادب کی شمع جلائی ہوئی ہے۔ علی گڑھ

یونیورسٹی ایلومنائی کے تعاون سے اپنے شہر میں کئی مشاعروں کا اہتمام کیا جس میں انڈیا اور پاکستان کے کئی معروف شعراء نے شرکت کی۔

ارژنگ: زندگی ہر موڑ پر انسان کوئی سبق سکھاتی ہے۔ آپ کی زندگی میں کوئی سبق آموز واقعات ہیں تو شیئر کیجیے تاکہ قارئین استفادہ کر سکیں۔

احمد ندیم رفیع: میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا ضرور چاہتا تھا لیکن کوئی وسائل نہیں تھے۔ اس لیے اس بارے زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ ایک دوست نے آئر لینڈ کی میڈیکل رجسٹریشن کی فیس جمع کروا دی اور وہاں سے خط لکھا کہ ٹکٹ کٹاؤں اور آ جاؤں۔ اس ایک واقعے نے میری زندگی کا دھارا ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال آئر لینڈ میں بہت آسودہ حالی میں گزارے اور اس دوران بہت سے ڈاکٹروں کو وہاں آنے اور جاب دلانے میں مدد کی۔ سبق یہ ہے کہ آپ لوگوں کی زندگی میں آسانیاں پیدا کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں بھی آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

ارژنگ: مناظر فطرت میں آپ کو کون سے منظر زیادہ پسند ہیں اور کیوں؟

احمد ندیم رفیع: مجھے موسموں کا تغیر بہت لبھاتا ہے۔ گرمی، سردی، بہار اور خزاں ہر موسم اپنے ساتھ خصوصی قدرتی مناظر لاتا ہے۔ جیسے بہار میں پھولوں کی بوقلمونی، گرما میں گھاس کی ہری بھری چادر، خزاں میں پتوں کا رنگ بدلتا پیرہن اور سرما میں برف کا غلاف یہ مناظر نہ صرف خوبصورت ہوتے ہیں اور بلکہ انسانی جذبات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

ارژنگ: آپ کے نظریات کا آپ کی شاعری میں کتنا عمل دخل ہے۔

احمد ندیم رفیع: میں شاعری کو انفرادی تجربات، جذبات اور تخیل کے آزادانہ اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ مخصوص نظریاتی وابستگی اظہار کی آزادی کو محدود کر سکتی ہے۔ میرے نزدیک رنگ و نسل، ثقافت اور مذہب کی تخصیص کیے بغیر باہمی محبت اور انسان دوستی کا پرچار ہی سب سے بڑا نظریہ ہے۔

ارژنگ: معاشرے میں ایک مثالی ادیب کی آپ کے نزدیک کیا خوبیاں ہیں۔ کیا ہمارے ہاں اس کی مثالیں موجود ہیں یعنی کون سے ادیب ان پر پورا اترتے ہیں۔

احمد ندیم رفیع: مثالی ادیب کو وسیع معلومات اور گہری معرفت کا حامل ہونا چاہیے، جس میں زبان، ادب، تاریخ، فلسفہ اور دیگر معاشرتی علوم شامل ہیں۔ علم انہیں اپنی تخلیقات میں معنویت اور گہرائی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تنقیدی سوچ اور تخلیقی صلاحیت کے علاوہ ایک مثالی ادیب کی تحریروں میں معاشرتی آگاہی، ایمانداری اور سچائی کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ معاشرے میں انسانیت کے احترام کو فروغ دینا بھی ایک مثالی ادیب کی خوبی ہوتی ہے۔ ادب کی دنیا مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ایک مثالی ادیب وہ ہوتا ہے جو مسلسل سیکھنے، اپنے آپ کو بہتر بنانے اور نئی ادبی تکنیکوں اور پیرایۂ اظہار کو آزمانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد فیض احمد فیض، ن م راشد، ناصر کاظمی اور مجید امجد نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے اردو شاعری کو نئی جہتیں بخشیں۔ ان لوگوں کی شاعری میں عشق، حسن، فلسفہ اور معاشرتی تبدیلیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ خواتین میں پروین شاکر کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے عورت کے جذبات، احساسات اور تجربات کو بڑی خوبصورتی اور سچائی سے پیش کیا۔

ارژنگ: آپ تنہائی پسند ہیں یا محفل کے آدمی ہیں؟

احمد ندیم رفیع: میں بنیادی طور پر تنہائی پسند ہوں۔ اگرچہ انسان معاشرتی مخلوق ہے اور ان سے اسے دوسروں کے ساتھ وقت گزارنے کی ضرورت ہوتی ہے، تاہم اکیلے وقت گزارنے سے آپ کو اپنی ذاتی دلچسپیوں اور شوق کو تلاش کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے جو ذاتی ترقی کی راہ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ تنہائی آپ کو خود کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع دیتی ہے۔ آپ اپنے جذبات، افکار اور زندگی کے اہداف پر زیادہ گہرائی سے غور کر سکتے ہیں۔ بہت سے مصور، موسیقار اور لکھاری تنہائی کو تخلیقیت میں اضافے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ اکیلے وقت گزارنے سے تخلیقی سوچ کو فروغ ملتا ہے۔

ارژنگ: آپ مسیحائی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ کیا اس کے تجربات و مشاہدات غزل کا حصہ بن پائے؟

احمد ندیم رفیع: ہر حساس شخص اپنے اردگرد کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میڈیکل پیشہ انسان جذبات، دکھ اور جینے کے تجربات کی ایک وسیع رینج کو سامنے لاتا ہے جو کہ اعری کے لیے زرخیز مواد فراہم کرتا ہے۔ موت، بیماری اور بحالی کے تجربات جذباتی گہرائی اور انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کا ذریعہ بنے۔ بحیثیت شاعر میں زندگی اور موت کے سوالات، اخلاقیات اور فلسفہ پر غور کرنے کے لیے مجبور ہوا۔ میڈیکل سائنس اور شاعری دونوں، اپنے اپنے طریقے سے، دنیا کی تفہیم اور تجربے کے ایک مخصوص زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ایک میڈیکل ڈاکٹر جو شاعر بھی ہو، وہ ان دونوں عالموں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔

ارژنگ: ویسے تو بقول غالب ”ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب“ آپ کی تین بڑی خواہشات کون سی ہیں؟

احمد ندیم رفیع: میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ پاکستان کو اپنی زندگی میں ایک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں دیکھ سکوں لیکن یہ بھی اب ایک دیوانے کا خواب لگنے لگا ہے۔

جس پہ چل کر کبھی منزل پہ نہیں پہنچے ہم
اسی رستے پہ سفر بارِ دگر کیا معنی

دوسری بڑی خواہش یہ ہے کہ کاش یہ دنیا امن و امان کا گہوارہ بن سکے۔ پچھلی چار دہائیوں میں ہونے والی جنگوں میں بے گناہ انسانوں کا اتنا خون بہا ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میری رائے میں مختلف

ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان تفاہم اور احترام میں اضافہ کر کے تنازعات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ معاشی استحکام اور عدل پر مبنی نظام دنیا میں امن کی بنیاد ہو سکتے ہیں کیونکہ اکثر تنازعات کی جڑیں معاشی مسائل میں ہوتی ہیں۔ تیسری بڑی خواہش یہ ہے کہ پاکستان واپس آ کر آباد ہو سکوں۔ بدقسمتی سے میرے جاننے والوں میں جتنے ڈاکٹر بھی پاکستان واپس گئے چند سال بعد مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔ جس معاشرے میں انصاف نہ ہو وہاں رہنا کسی جہاد سے کم نہیں۔

ارژنگ: کبھی ادبی پرچہ شائع کرنے کا خیال آیا؟

احمد ندیم رفیع: اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ البتہ میڈیکل کالج میں بطور مدیر کچھ میگزین میں کام کیا۔ امریکہ میں پاکستان ڈاکٹروں کی تنظیم اپنا (APPNA) کے میگزین کے اردو سیکشن کے لیے بطور مدیر کام کیا۔ اس کے علاوہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل امریکہ کی المنائی (KEMCA) کے میگزین کی ادارت بھی سنبھالی۔

ارژنگ: اگر روزگار کے اچھے مواقع میسر ہوں تو آپ کہاں رہنا چاہیں گے پاکستان یا امریکہ؟

احمد ندیم رفیع: یقیناً پاکستان میں، خیال تو یہی ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان منتقل ہو جاؤں بشرطِ زندگی۔

ارژنگ: ماہنامہ ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام۔

احمد ندیم رفیع: ایک معیاری ادبی رسالہ نکالنا بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ سب سے پہلے تو ماہنامہ ارژنگ کے منتظمین اور ادارے کو سلام جنہوں نے ان مشکل حالات میں بھی بغیر کسی اشتہاری معاونت کے اس شمع کو پچھلے چوبیس سال سے جلا رکھا ہے۔ میری قارئین سے یہی درخواست ہے کہ سالانہ خریدار بن کر اس رسالے کی کامیابی میں اپنا حصہ ڈالیں۔

نسیمِ سحر/اسلام آباد

جو وحشت بہت دل پہ طاری ہوئی
تو شب بھر ستارہ شماری ہوئی

مرے زخم اتنے ہی گہرے ہوئے
مری جس قدر غم گساری ہوئی

وہیں لوگ پیاسے بھی مرتے رہے
جہاں سے کوئی نہر جاری ہوئی

کوئی یاد آتا رہا رات بھر
بہت رات بھر آہ و زاری ہوئی

شکایت تھی دستِ اجل سے ہمیں
مگر زندگی بھی شکاری ہوئی

سفینے وہ ساحل پہ ڈوبے ہوئے
وہ کشتی بھنور میں اُتاری ہوئی۔

ہمارا یہاں اب گزارا نہیں
یہ دُنیا بڑی کاروباری ہوئی

مجھے چند لمحوں کی سوغات دو!
مری زندگی تو تمہاری ہوئی

خزاں موسموں میں گھرا تھا یہ دل
تری یادِ بادِ بہاری ہوئی

نسیم اب نئی ایک بازی لگے
یہ بازی تو لگتی ہے ہاری ہوئی

✦✦✦

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

جو رب کے سامنے سرخم نہ ہوں گے
تو فتنے زندگی میں کم نہ ہوں گے
چلیں گے سلسلے بھی زندگی کے
مناظر موت کے بھی کم نہ ہوں گے
گئے زیرِ زمیں انسان لاکھوں
کبھی سطحِ زمیں پر ہم نہ ہوں گے
فنا کے بعد ہے منزل بقا کی
نہیں ہے غم جو اک دن ہم نہ ہوں گے
سدا میلے سجیں گے زندگی کے
سجے گی بزمِ یاراں ہم نہ ہوں گے
اُجڑ جاتی ہیں آخر محفلیں سب
سدا ہی دورِ جامِ جم نہ ہوں گے

✦✦✦

اسد نصیر

نمکین غزل

خواہشِ عقدِ ثانی رد کر دی
زوجہ بدگماں نے حد کر دی
اس نے تو خیر صرف ڈانٹا ہی
اس کے بھائیوں نے تھوڑی "ود" کر دی
مالکِ عالمِ تغیر کیوں
ایک بیوی ہی تا ابد کر دی
بیوی کافی تھی جان لینے کو
ساس بھی صورتِ رسد کر دی
سب حسیناؤں سے ہے چڑ اس کو
قربِ جاں پیکرِ حسد کر دی
دستِ نازک میں آ گیا چمٹا
منتشر حالتِ اسد کر دی

CS CamScanner

خزاں کے رنگ

عامر بن علی/ جاپان

پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات و واقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80%) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔پہاڑ بھی سر سبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خورد و نوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں ،تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔کہیں ٹولیوں کی شکل میں کسی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ'' ہنامی'' کا لفظی ترجمہ پھول تکنا ہے۔خزاں کے رنگ بدلتے ،گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔یوں کہہ لیجیے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو ''موی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔ ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں'' نارا'' عہد کہتے ہیں، اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو'' زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔پس دیوار زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے، اس نظارے کا سبب سترہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروکار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پروہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔ منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے، زرد، خشک، نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔میپل کو اردو اور فارسی میں ''افرا'' کہتے ہیں۔مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک ''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔اسی لیئے مجھے شوکمار بٹالوی کا ''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی ۔مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے، پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا، جن پر لدے، پھندے، پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کئے جا رہے تھے۔پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں، جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل و حرکت محدود ہو جاتی ہے۔پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گرد و نواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے، اور ثقافتی و سماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

سفر نامہ

یورپ کے آئینے میں خود کلامی

حسن عباسی/لاہور

تیسری دنیا کے ممالک کے باشندوں کے لیے یورپ سہانے سپنے کی طرح ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے آنکھ کھل جانے کا دھڑکا ساتھ ساتھ چلتا ہے ہے۔ کہتے ہیں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا، اس طرح کہا جا سکتا ہے جس نے یورپ نہیں دیکھا وہ جوان نہیں ہوا۔ یورپ میں ہر چیز جوان ہے صرف بڑھاپے کا احساس بوڑھا ہے۔ پہلی بار یورپ جانا ایک نئی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ ایک ایسی دنیا جو طلسماتی ہے۔ فطرت یورپ پر فدا ہے اور اہل یورپ فطرت پر۔ یورپ کے حسن کا ڈنک اس سانپ کی طرح ہے جس سے دوبارہ ڈسوانے کے لیے طبعیت بے چین رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ سیاح بار بار ادھر کا رخ کرتے ہیں اور ان کا جی اس کے فطری مناظر، تاریخی مقامات اور شہروں کی خوب صورتی سے نہیں بھرتا۔ ہم یورپ کی ترقی کو رشک بھری آنکھوں سے جبکہ اپنے وطن کو اشک بھری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ سفر کے دوران جھیلوں کے کنارے آباد ٹاؤنز دیکھ کے لگتا ہے جیسے سیاحوں کا دل چرانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تاریخی عمارات اتنی دل کش ہیں ان کے سایہ دیوار سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کسی میوزیم میں داخل ہو جائیں تو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔ سیاح خو کو بھول جاتا ہے۔ ماضی کے مردہ ادوار سے تاریخ، کلچر اور تہذیب زندہ ہو جاتے ہیں۔

گھاس اور سبزے کے ڈھلوانی میدان، نشیب و فراز، پن چکیاں، دریا، قوس و قزح اور ان میں پگڈنڈیاں بادلوں کی ٹکڑیوں میں گم ہوتی ہوئیں، سفر کے دوران ایسے نظارے بارہا آنکھوں سے لپکتے ہیں۔

اللہ کی، مین پر اب اس کا نائب آزادانہ نہیں گھوم سکتا۔ قل سیروا فی الارض کی آیت پہ عمل کرنے کے لیے اسے ویزہ درکار ہوتا ہے۔ ویزہ بظاہر تو چھوٹا سا لفظ ہے مگر یورپ کے ویزہ کا حصول کارِ سہل نہیں۔ دنیا میں لاکھوں آنکھوں کے سپنوں کی تعبیر اس سے مشروط ہے۔ پاسپورٹ پر ویزہ کا اسٹیکر دیکھ کر جو خوشی ملتی ہے اور ریفوزل کی اسٹیمپ دیکھ کر جو دکھ ہوتا ہے ان کیفیات کو صرف وہی دل محسوس کر سکتے ہیں جو ویزہ کے پراسیس سے گزرے ہوتے ہیں۔

نارویجین ایمبیسی کی ویزہ آفیسر نے جب پاسپورٹ مجھے واپس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "Enjoy" تو میری آنکھیں بہت سے ان دیکھے سپنوں سے بھر گئیں۔۔۔

یوں تو ہر صبح خوشگوار ہوتی ہے لیکن کوئی صبح خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ یادگار اور شاندار بھی ہوتی ہے۔ گھر سے علامہ اقبال ایئرپورٹ تک ایسی ہی صبح میرے ہمراہ تھی۔ جہاز نے اُڑان بھری تو لاہور شہر یوں دور ہوتا گیا جیسے غلط فہمی میں رشتے دور ہو جاتے ہیں۔

کھڑکی تھی کہ جمشید کا جامِ جم تھا۔ میں اس سفر میں پوری دنیا دیکھ رہا تھا۔ پلک جھپکنے میں نظارہ بدل جاتا۔ سرسبز میدان یوں دکھائی دیتے جیسے درویشوں کی پوشاکیں دھوپ میں خشک ہو رہی ہوں۔ پہاڑ بے روزگار نوجوانوں کی طرح منہ لٹکائے خالی ہاتھ حسرت سے ہمیں دیکھتے تھے۔ دھوپ میں سفید بادلوں کی ٹکریاں یوں لگتیں جیسے کپاس کی ڈھیریاں رکھی ہوں۔ سمندر تھا یا سمندر کی پینٹنگ اور اس پینٹنگ کا حصہ ہم بھی لگ رہے تھے۔ سیاہ بادل اوباش نوجوانوں کی طرح فلائٹ کو چھو کر گزر رہے تھے۔ کبھی جہاز ایسی تاریکی میں داخل ہو جاتا جس سے گزشتہ 77 برس سے پاکستان گزر رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں سب مسافر حکمرانوں کی طرح آنکھیں بند کر کے سو جاتے۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو نیلے پانیوں پہ رنگین کشتیاں تیر رہی تھیں۔ رنگ برنگے بادبانوں سے یوں لگتا جیسے تتلیاں اُڑی جا رہی ہوں۔ سبزے کے میدان گرین کارپٹس میں ڈھل گئے تو اندازہ ہوا کہ منزل قریب ہے۔ آٹھ گھنٹے کی ڈائریکٹ فلائٹ کے بعد جہاز کسی ساحلی آبی پرندے کی طرح لہراتا ہوا اوسلو ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ خوشگوار آب و ہوا اور ٹھنڈی دھوپ نے ہمارا استقبال کیا۔

اوسلو ائیرپورٹ سے باہر میزبان جمشید مسرور اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھے۔ ان کا گھر شہر کی رونق سے دور نہایت پُرسکون جگہ لنڈے برگساں میں ہے۔ دریچوں کے پردے ہٹائیں تو شیشوں کے پار جنگل گھر کا صحن لگتا ہے جہاں کبھی کبھی ہرن دکھائی دیتے ہیں۔ درختوں کی شاخوں پہ نہایت خوبصورت اور خوش الحان پرندے آ بیٹھتے ہیں۔ اس جنگل سے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ اوسلو میں دن اور رات کے فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے میں اوائل دنوں میں پریشان رہا کہ وہاں لوگ ظہر اور عصر کی نماز رات کو کیوں پڑھتے ہیں۔

یورپ کے موسم گرما میں عجیب سی خنکی ہے جو رگ و پے میں داخل ہو تو نشہ طاری ہونے لگتا ہے۔ لِس ڈے برگساں میں شہر خاموشاں جیسا سکوت اور تنہائی ہے۔ کسی نے خوب صورتی کو یہاں تجسیم کر کے اس کے ہونٹ سی دیے ہیں۔ کہیں سے کوئی آواز آتی ہے تو لگتا ہے کنوئیں میں پتھر پھینکا گیا ہے۔ ہر طرف پہاڑ ہیں درخت ہیں۔ پگڈنڈیاں اور ڈھلوانیں ہیں۔ موسم سرما میں اس کا حسن منفرد اور جدا ہوتا ہے۔ برف اور حد نظر تک برف۔

بیگانگی یہاں کی فضا میں گھلی ہوئی ہے۔ خوب صورتی اور اجنبیت اس وادی کی دو بنیادی خصوصیات ہیں۔ میں جہاں جہاں سے گزرتا ہوں سوئے سوئے دل نشیں مکان ایک بار پلکیں اٹھا کے دیکھتے اور پھر سو جاتے ہیں۔ گھروں سے باہر جھولے بچوں کی راہ تکتے ہیں۔ گرمیوں میں خال خال کسی گھر کا سوئمنگ پول آباد ہوتا ہے۔ سڑک پہ چلتے ہوئے کبھی کبھار اچانک کوئی تیز رفتار سائیکل سوار ہوا کے جھونکے کی طرح پاس سے گزر جاتا ہے۔

گرمیوں میں لگاتار بارشوں اور سردیوں میں برف باری کے باعث یہاں کی مٹی Hulk کی طرح طاقت ور ہو چکی ہے۔سبزہ سڑک کو چیر کر باہر نکل آیا ہے۔دونوں بازو اور سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا ہے۔سڑکوں پر خودرو پھول بھی نظر آ رہے ہیں۔

(فروگنر پارک)

میں اس وقت فروگنر پارک میں ہوں۔یہاں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔اس تفریحی پارک کو رومینٹک پارک بھی کہا جاتا ہے۔بارش نے اسے مزید رومینٹک بنا دیا ہے۔اس وقت میں پارک کے اندر ایک پل پر ہوں جہاں کانسی کے بنے 58 مجسمے ایستادہ ہیں۔اور یہ روزمرہ زندگی کی مختلف انسانی حالتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔اس پارک میں کل مجسموں کی تعداد 212 ہے۔زیادہ تر مجسمے کانسی اور گرینائٹ کے بنے ہوئے ہیں۔اور یہ تمام مجسمے لیجنڈ مجسمہ ساز Gustav vigeland کے ہاتھوں کے شاہکار ہیں۔ایک آرٹسٹ کے بنائے ہوئے اور نصب کیے گئے مجسموں کے حوالے سے یہ دنیا کا سب سے منفرد اور بڑا پارک ہے۔جو کہ 80 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔جس میں جھیل، باغات، سبزے کے میدان، پھولوں کی کیاریاں اور سرسبز و شاداب درختوں کی بہتات ہے۔مجسمے پارک کے وسط میں ایستادہ ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں۔1920 سے مجسموں کی سجاوٹ کا کام شروع ہوا اور 1940 میں اس کا پہلا حصہ عوام کے لیے کھولا گیا۔بچوں، خواتین، مردوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے مجسمے اس طرح نصب ہیں کہ زندگی کی خوشیاں، دکھ، شرارتیں اور مسائل گویا سب کچھ ان میں نظر آتا ہے۔بچوں کے مجسموں میں Angry Boy کا مجسمہ بہت مشہور ہے اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ایک مجسمے میں مرد اور عورت کو دائرے کی شکل میں دکھایا گیا ہے جو کہ گیند کی صورت میں باہم ملے ہوئے ہیں۔اس کا تصور ہمیں قدیم یونان میں ملتا ہے کہ پہلے مرد اور عورت اس طرح باہم ملے ہوئے تھے۔اس سے کائنات میں ان کی مرکزیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔افلاطون نے سمپوزیم میں کہا ہے کہ ابتدا میں انسان گول ہوتا تھا اور دونوں جسم مرد اور عورت جڑے ہوئے ہوتے تھے۔یہ تصور قدیم تہذیبوں کی مشترکہ میراث ہے۔چینی تہذیب میں بھی ین اور یانگ دائرے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

پارک میں سب سے قابل دید مقام 1412 میٹر لمبا ٹاور ہے۔جس میں 121 برہنہ اجسام باہم ملے ہوئے ہجوم کی صورت اوپر چڑھ رہے ہیں۔اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس شاہکار کو ایک ہی بھاری پتھر سے تراشا گیا ہے۔اس لیے اسے Monolith Tower بھی کہتے ہیں۔یہ اجسام جہاں ایک طرف اتحاد و یگانگت کی علامت اور شبیہہ ہیں وہاں ان کا اس طرح آسمان کی طرف دیکھنا اور اوپر چڑھنا انسان اور خدا کے باہمی تعلق اور کشش کو بھی ظاہر کرتا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے کے گلے مل کر اور ایک دوسرے کو تھام کر نجات کا کوئی راستہ تلاش کر رہے ہیں۔

❖❖❖

بہ یاد: سید قاسم محمود

ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور

Book Digest

ISSN 2079-4584

مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ

رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زر تعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

برائے خط وکتابت / ترسیل زر / رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

ماہنامہ الحمرا لاہور

بہ یادِ حضرت مولانا حامد علی خاں

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیر ادارت

شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم، محفل احباب، خصوصی گوشے، ہر شمارہ ایک نیا زاویہ، ایک نئی خوشبو

اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ماہنامہ ''الحمرا'' میں آپ کا پُرخلوص خیر مقدم ہے!

اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں

J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور، 0333-4001844

ادبی تقریبات

20 دسمبر 2025 کو سخن اکادمی کے زیر اہتمام کبیر والا میں معروف شاعر ادیب دانشور سید حسنین اصغر تبسم کی دوسری برسی پر شاندار تقریب۔

حسنین اصغر تبسم کی شاعری آئینے کی طرح تھی وہ قاری کو خود اس کا چہرہ دکھاتی ہے۔ ان کے استعارے زمین سے جڑے ہوئے تھے، مگر معنی آسمان تک جاتے تھے۔ محبت ان کے ہاں محض جذبہ نہیں، ایک ذمہ داری ہے؛ ہجر ایک شور نہیں، ایک ضبط شدہ چیخ؛ اور امید ایک چراغ ہے جو اندھیروں سے بحث نہیں کرتا، بس جلتا رہتا ہے۔ امن ان کی شاعری کا مستقل حوالہ تھا۔ وہ ظلم کے مقابل نفرت نہیں بوتے تھے، وہ دعا رکھتے تھے ایسی دعا جو ظالم کو بھی انسان سمجھ کر مخاطب کرتی ہے۔ اور جب قلم کو گواہی دینی پڑتی، تو وہ پیچھے نہیں ہٹتے؛ انا کو لفظوں کے سامنے سرنگوں کر دیتے، ان خیالات کا اظہار سخن اکادمی کبیر والا کے زیر اہتمام معروف شاعر سید حسنین اصغر تبسم کی دوسری برسی کے موقع پر منعقدہ تقریب و مشاعرہ سے مہمان خصوصی صدر انجمن صحافیاں و پریس کلب کبیر والا سید فرخ رضا نے اپنے خطاب میں کیا۔ صدر تقریب معروف دانشور منیر راہی نے اپنے خطاب میں کہا کہ حسنین اصغر تبسم کی شاعری جہاں دلوں کو گداز عطا کرتی ہے، وہاں ترقی پسندانہ نظریات کی عکاسی بھی کرتی ہیں، حسنین اصغر تبسم کی شاعری پر اہل سخن کو ناز کرنا چاہیے، حسنین اصغر تبسم کی شاعری میں زندگی کے تمام رنگ چمکتے اور تمام خوشبوئیں مہکتی نظر آتی ہیں، حسنین اصغر تبسم کی شاعری میں جہاں محبت اور رومانویت موجود ہے، وہاں مظلوم طبقات کی زندگی کی تلخیاں اور محرومیاں بھی نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ مہمان اعزاز ریاض شاہد خان پنیاں نے کہا کہ سید حسنین اصغر تبسم کبیر والہ کا ایک ایسا خوبصورت غزل اور نظم کا بھرپور شاعر ہے جس کی شاعری ایک عہد پر محیط ہے۔ آپ کی غزل کے توانا اور رومانوی لہجے کو جدید شاعری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ نظم کی روانی اور بہاؤ ان کے ہاں ایک ایسا خوبصورت منظر نامہ بناتی ہے جسے پڑھنے والے پر ایک سحر طاری ہو جاتا ہے۔ نظم و غزل کے شاعر کی حیثیت سے شاعری میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میزبان تقریب چیئرمین سخن اکادمی سید سہیل اصغر عابدی نے اپنے خطاب حسنین اصغر تبسم کی وفات کو علمی و ادبی دنیا کا بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کا خلاء طویل مدت تک پر نہیں ہو سکے گا، آج کبیر والا کی دھرتی پر یہ تاریخی لمحات سدا یاد رہیں گے کہ جب حسنین اصغر تبسم کی یاد میں منعقدہ تقریب میں کبیر والا کے تمام گروپ اور تنظیموں کی اعلیٰ ادبی شخصیات کی بھرپور شرکت حسنین اصغر تبسم کے ساتھ محبت اور ان کے ادبی و علمی قد کاٹھ کی بلندی کا بھرپور اظہار ہے۔ انہوں نے تقریب کے تمام شرکاء بالخصوص شعراء ادباء کی بھرپور شرکت پر ان کا دلی شکریہ ادا کیا۔ تقریب سے کالم نگار سید ذوالقرنین حیدر بخاری، شعراء کرام تاثیر جعفری، عمار یاسر مگسی، ملک عمر طارق، طارق جاوید، محمد علی ایاز، سید شہزاد رضا، سید محمد کاظم مہدی، سید حسنین اکبر، محمد نعیم طارق، سجاد اکبر شاہ، ملک شجاعت حسین، حافظ دانیال خان پنیاں، شہریار خان پنیاں اور دیگر نے خطاب کیا اور حسنین اصغر تبسم کی شاعری اور ادبی خدمات پر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب میں معروف سیاسی، سماجی، ادبی شخصیات سید منتظر مہدی، سید احتشام رضا، سید عمران ہاشم رضا ترمذی، ڈاکٹر سید تراب حیدر گردیزی، مبشر حسن خان بھٹہ، عمران رزمی، سید امجد مہدی، علی ناصر کمال خان، محسن رضا شانی، غلام قاسم ایری۔ چوہدری محمد نوید جٹ، ملک محمد حسنین ڈھڈی، مہر عالمگیر ہراج، مہر محمد حمزہ مرالی، ساجد توصیف، معاذ اعجاز خان اور دیگر شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

☆☆☆

معروف شاعر ادیب دانشور عامر بن علی نے حسنین اصغر تبسم کی دوسری برسی پر مرحوم حسنین اصغر تبسم کے چھوٹے بھائی معروف شاعر سید سہیل اصغر عابدی کے نام اپنے خصوصی پیغام میں حسنین اصغر تبسم کی خوبصورت شاعری کو عظیم ادبی دستاویز قرار دیتے کہا کہ آنے والی نسلوں کے لیے حسنین اصغر تبسم کی شاعری مشعل راہ بنے گی انہوں نے بھی ان کی خوبصورتی شاعری کو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ قرار دیا۔

☆☆☆

پروفیسر ملک ناصر داود صاحب کی کتاب "نبی عادل" کی تقریب رونمائی

ہزارہ اباسین آرٹس کونسل ایبٹ آباد کے زیر اہتمام سیرت نبوی صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم کے موضوع پر ہندکو میں لکھی پروفیسر ملک ناصر داود صاحب کی کتاب کی رونمائی کی تقریب اباسین ہال جلال بابا آڈیٹوریم ایبٹ آباد میں معروف ادیب اور افسانہ نگار ڈاکٹر عادل سعید قریشی کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر 1 ایبٹ آباد کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر محمد آفتاب مہمان خصوصی اور معروف شاعر و ادیب قاضی ناصر بخت یار خان مہمان اعزاز تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض کونسل کے مشیر ادبیات عبدالوحید بسمل نے ادا کیے۔

تقریب کا آغاز تلاوت قرآن مجید فرقان حمید سے ہوا جس کی سعادت حمزہ طفیل نے حاصل کی۔ خوش الحان نعت خواں حافظ عاطف اور کونسل کے دیرینہ رکن اور معروف نعت خواں یاسر علی نے گل ہائے عقیدت بحضور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نچھاور کر کے حاضرین کے قلب و

روح کوخوب منور کیا۔

ناظم تقریب نے اپنے تمہیدی کلمات میں کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے تعارفی گفتگو کی جس کے بعد مقالہ جات کا دور شروع ہوا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمتین اور راجہ ہمایوں صاحبان نے نہایت پرمغز مقالوں سے کتاب مزکورہ کی اہمیت اور ہندکو دینی ادب میں خوبصورت سیرت نگاری کے جذبے کو اجاگر کیا۔

مہمان اعزاز قاضی ناصر بخت یار خان نے ہندکو میں سیرت اور نعت کے حوالوں سے گزشتہ دو دہائیوں میں ہونیوالے کام پر روشنی ڈالتےہوئے صاحب کتاب کو خراج تحسین پیش کیا۔۔

صاحب کتاب جناب پروفیسر ناصر داود ملک نے اپنے سیرت نگاری کے جزبے کی ابتدا اور شائع ہونے والی کتب کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ اور اتنی پروقار تقریب کے انعقاد پر ہزارہ اباسین آرٹس کونسل کے جملہ اراکین اور تقریب میں شرکت کرنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر محمد آفتاب نے اپنے خطاب میں کتاب کی اہمیت اور صاحب کتاب کی سیرت نگاری کے جذبے کو خوب سراہا اور اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔

خطبہ صدارت سے پہلے ناظم تقریب نے تمام شرکائے تقریب کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا اور اسلام آباد سے خصوصی شرکت کرنے والے راجہ امجد علی، بفہ سے جناب اختر نعیم، مانسہرہ سے جناب اختر زمان، جناب عظیم ناشاد، حویلیاں سے میڈم شائستہ چوہدری ایڈووکیٹ، جناب محمد منیر اور انکے ساتھی، ایبٹ اباد سے میڈم محمودہ چوہدری، جناب محمد ادریس ایڈووکیٹ، جناب شکیل اعوان، جناب اقبال ککوروی، جناب کامران خلوص، جناب راحیل عباس بارک زئی، جناب مدنی اعجاز، جناب امین صادق، جناب سہیل صمیم جناب ڈاکٹر ضیاءالرشید، جناب امتیاز الحق امتیاز اور دیگر مہمانان گرامی کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے صاحب صدارت کو دعوت خطاب دی۔

صاحب صدارت ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے اپنے صدارتی کلمات میں ہزارہ کے ہندکو لکھاریوں اور کتابوں کا حوالے دیتے ہوئے ہندکو ادب اور زبان کے مستقبل سے پر امید رہتے ہوئے نظم ونثر دونوں شعبوں میں مزید عمدہ اور کارآمد کتابوں کے سامنے آنے کی امید کے ساتھ پروفیسر ناصر داود ملک کو مبارکباد پیش کی اور ہزارہ اباسین آرٹس کونسل کے سیکرٹری خالد وحید قریشی اور مشیر ادبیات عبدالوحید بسمل اور ان کی پوری ٹیم کو ایک معیاری اور پروقار تقریب کے انعقاد پر خراج تحسین پیش کیا۔

تقریب کا اختتام شرکا کی عمدہ انٹرٹینمنٹ پر ہوا۔

رپورٹ: عبدالوحید بسمل

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل کے دولت کدے پر بروز اتوار، 7 دسمبر 2025ء ہفتہ وار علمی و ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں ممتاز ادبی شخصیات محمد حمزہ فاروقی، طارق بن آزاد، طارق رحمٰن فضلی، افتخار احمد خانزادہ، شاعر علی شاعر، وقار شیرانی، مسعود کمالی، بدر منیر اور محمد عارف سومرو شریک ہوئے۔

نشست کا آغاز دوستانہ اور علمی ماحول میں ہوا، جس میں اردو زبان کی موجودہ صورتِ حال، تحقیق کے بدلتے تقاضے، کثیر لسانی معاشروں کے لسانی مسائل، اور مختلف ممالک کی تاریخ و ثقافت پر بھرپور گفتگو ہوئی۔ شرکائے نشست نے اپنے علمی تجربات اور مشاہدات پیش کیے اور معاصر اردو تحقیق کے مسائل و امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔

آخر میں میزبان ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ نشست میں مزید موضوعات پر گفتگو کے عزم کا اظہار کیا۔

رپورٹ: محمد عارف سومرو

☆☆☆

شکرگڑھ بار کونسل کا مشاعرہ، ایک ایسا ایونٹ تھا جس میں ایک بہترین ادبی محفل کی ساری خصوصیات نمایاں ہوئیں۔ اس محفل میں نہ صرف شعر و ادب کی لطافتوں کا شعور تھا بلکہ اس کی ترتیب و انتظامات نے اس محفل کو مزید یادگار بنا دیا۔ ایڈوکیٹ زاہد کی مہمان نوازی اور انتظامات کی تعریف کے بغیر اس محفل کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی محنت اور لگن نے اس محفل کو کامیابی کی بلند ترین سطح پر پہنچا دیا۔

اس مشاعرے میں ایڈوکیٹ حسن اختر کی جانب سے پیش کیا گیا پرتکلف کھانا اور بہترین استقبال نے محفل میں ایک خاص رنگ بھرا۔ ایسے مواقع پر کھانا صرف جسم کی ضرورت نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک ادبی محفل کا حصہ بنتا ہے، جو محفل میں موجود لوگوں کی محبت و عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ ایڈوکیٹ حسن اختر کی جانب سے کی گئی پرتکلف میزبانی اور عمدہ استقبال نے مشاعرہ میں شرکت کرنے والوں کو ایک خاص انس محسوس کروایا، اور ان کی تواضع نے اس محفل کو اپنے ذائقیا میں بھی خاص بنا دیا۔

اس مشاعرے میں ایڈوکیٹ برادری کا جو ولولہ اور جذبہ تھا، وہ قابلِ دید تھا۔ ایک طرف جہاں شعرا کی آوازوں میں ادب کی گہرائی تھی، وہیں ایڈوکیٹ برادری کا جوش و جذبہ تھا، وہ مشاعرہ کی کامیابی میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ ان کی دلچپی اور توجہ نے محفل کی رونق بڑھا دی، اور محفل میں دلچپی کی ایک نئی سطح پیدا کی۔

مشاعرے میں مختلف اضلاع سے شرکت کرنے والے شعرا کی فہرست بھی بے حد دلچسپ تھی۔ لاہور سے ہمارے ساتھ افضل پارس، جالد محمود آشفتہ، منزہ سحر، وفا تبسم آزر، سعادت علی سعدی، اور یسین عامر کی موجودگی نے محفل میں ایک خاص شان پیدا کی۔ یہ شعرا نہ صرف اپنے اشعار کی گہرائی کے لئے مشہور ہیں، بلکہ ان کی شخصیت میں بھی ایک خاص جاذبیت ہے جو مشاعرہ میں رنگ بھر دیتی ہے۔ ان کی شرکت نے اس محفل کو ایک ادبی ایونٹ کے طور پر نمایاں کر دیا، جہاں ہر شعر ایک نئی کہانی کہہ رہا تھا، اور ہر لفظ میں زندگی کی حقیقتوں کی گونج تھی۔

میزبانوں کا استقبال اور مشاعرے کے

انتظامات بے مثال تھے۔ یہ محفل ایک عہد کی علامت بن کر ابھری، جہاں تمام انتظامات میں توازن اور حسن تھا۔ مشاعرے کے بعد رہائش کا انتظام بھی کسی اعلیٰ معیار کا تھا، جس سے شعرا اور دیگر شرکاء کو نہ صرف ذہنی سکون ملا بلکہ ان کی تھکن بھی دور ہوگئی۔

اس مشاعرے میں شعراء نے جس طرح اپنے اشعار کی جادوئی قوت سے محفل کو گرمایا، اس کا جواب دینا ممکن نہیں۔ ہر ایک شعر پر داد و تحسین کا جو زور تھا، وہ نہ صرف شاعر کی ہمت افزائی کرتا تھا بلکہ حاضرین کے دلوں میں ایک نئی توانائی پیدا کرتا تھا۔ ہر ایک شعر ایک نئے احساس کا آئینہ تھا، اور ہر لفظ میں ایک نئی دنیا کی کہانی چھپی ہوئی تھی۔

مشاعروں کی یہ روایات خاص طور پر ہمارے ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں۔ ادبی محفلیں، جہاں ہر فرد کو اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع ملتا ہے، نہ صرف ادب کی ترقی کا سبب بنتی ہیں بلکہ معاشرتی تعلقات کو بھی مضبوط کرتی ہیں۔ مشاعرے ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں جہاں نہ صرف تخلیقی ذہنوں کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ یہ ایک دوسرے کو سمجھنے اور عزت دینے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے اپنے دل کی آواز سناتا ہے، اور سننے والا اس آواز میں اپنی زندگی کے رنگ تلاش کرتا ہے۔

ایسے مواقع پر شعرا کی آواز میں ایسا سحر ہوتا ہے جو ہر سننے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعرے ہماری ثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں، جہاں انسانیت، محبت اور ادب کی جڑیں مزید گہری ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شکرگڑھ بار کونسل کا مشاعرہ نہ صرف ایک ادبی محفل تھی، بلکہ ایک محنت، جذبے اور محبت کا عکاس تھا۔ اس محفل میں ہر فرد نے اپنے حصے کا اضافہ کیا، اور اس کا اثر دلوں میں دیر تک باقی رہنے والا تھا۔ اُس مشاعرے نے ایک دفعہ پھر یہ ثابت کیا کہ ادب ہماری زندگی کا حصہ ہے، اور ایسی محافل ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں، اور ہماری تہذیب و ثقافت کے رنگوں کو مزید چمکاتی ہیں۔

بارِ دگر منتظمین کا دلی شکریہ

رپورٹ: ڈاکٹر دانش عزیز

☆☆☆

دبستانِ لاہور میں بھائی کاظم ناصری کا دم غنیمت ہے جو رثائی ادب کے حوالے سے خود بھی متحرک رہتے ہیں اور دیگر احباب کو بھی مسلسل اس خدمت میں مصروف رکھتے ہیں۔ اس اتوار لاہور میں بزمِ راحتِ سخن اور خیالِ نو کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی رثائی ادب کانفرنس کے لئے جناب ڈاکٹر عرفی ہاشمی اور بے مثال شاعرِ اہلِ بیت جناب مظہر عابدی لاہور میں موجود تھے ان کی موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کاظم بھائی نے اپنے دولت کدہ پر ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں قریبی احباب نے شرکت کی، عرفی بھائی سے 2012 کے بعد گزشتہ شب دوبارہ ملاقات ہوئی تو یادوں کے کئی در وا ہوئے، میرا شمار اس گھرانے کے نیاز مندوں میں ہوتا ہے، اُن کے والدِ گرامی مرحوم وحید الحسن ہاشمی اس شہر لاہور میں شجرِ سایہ دار تھے۔ رثائی ادب کے حوالے سے ایک بڑا نام، ڈاکٹر شبیہ الحسن میرے استاد بھی تھے اور سینئر دوست بھی ان سے بھی ہم نے بہت کچھ سیکھا، افسوس اُن جیسے معصوم انسان کو اسی شہر لاہور میں شہید کر دیا گیا۔ عرفی بھائی سے ملاقات ہوئی تو دل شاد ہوا، یادیں تازہ کیں اور ہمیشہ کی طرح ان سے مل کر بہت اچھا لگا، ان سے میری آخری ملاقات دو ہزار بارہ میں الحمرا میں ڈاکٹر شبیہ الحسن شہید کے تعزیتی ریفرنس میں ہوئی تھی، تیرہ سال بعد بھی عرفی بھائی ویسے ہی گرم جوش اور پیارے انسان ہیں۔ فنِ نوحہ نگاری میں دو نام ہمیشہ سے میرے دل کے قریب ایک مرحوم ڈاکٹر ریحان اعظمی اور دوسرے بھائی مظہر عابدی، جس دن سے کاظم بھائی نے بتایا کہ مظہر بھائی کانفرنس کے لئے لاہور تشریف لا رہے ہیں میں نے دن گن گن کر گزارے کیونکہ مظہر بھائی سے ملاقات کا اشتیاق زمانے سے تھا لیکن نہ وہ لاہور آتے تھے نہ میرا کراچی جانا ہو رہا تھا، ڈاکٹر ریحان اعظمی تو اکثر جشن پڑھنے لاہور تشریف لاتے تھے تو امام بارگاہ گلستان زہراؑ، ایبٹ روڈ میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی، گزشتہ شب بھائی کاظم ناصری کی بدولت یہ خواہش بھی پوری ہوئی اور مظہر بھائی جس محبت اور گرم جوشی سے ملے بہت اچھا لگا، پاکستان میں اس وقت فنِ نوحہ نگاری میں مظہر بھائی ایک درسگاہ ہیں ان کا قلم اس قدر رواں ہے کہ ہزاروں نوحے ان کے کریڈٹ پر ہیں انہیں انشااللہ اس اتوار بزمِ راحتِ سخن اور خیالِ نو کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی رثائی ادب کانفرنس میں ان کی خدمات پر نجم آفندی ایوارڈ برائے اعترافِ خدمات پیش کیا جائے گا، کسی کے کام کو اس کی زندگی میں ہی سراہنا ایک بہت بڑی کاوش ہے، جس کے لئے بزمِ راحتِ سخن اور خیالِ نو مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کاظم بھائی کے ہاں دوستوں کا ایک گلدستہ جمع تھا سب سے ملاقات ہوئی نوجوان شعراء سے مل کر دل کو تسکین نصیب ہوئی، عرفی بھائی کی عالمانہ گفتگو نے خوب رنگ جمایا، پہلے شعری نشست جمی ہم سب نے کوشش کی کہ مختصر حاضری پیش کریں اور مہمانوں کو زیادہ سنیں عرفی بھائی اور مظہر بھائی نے لاجواب کلام سنایا۔ اختتام پر کاظم بھائی نے لذیز ترین ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا جو اس گھرانے کا خاصہ ہے، میں کاظم بھائی کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس قیمتی اور یادگار نشست میں شرکت کی دعوت دی، ان کے خانوادے کے لئے دل سے دعائیں جو پل پل رثائی ادب کی ترویج کے لئے کوشاں ہے۔

رپورٹ: وسیم عباس

☆☆☆

ذہنی آسودگی خالقِ کائنات کی بے مثال نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اس بات کا احساس اس وقت شدت سے بڑھ جاتا ہے جب ہم فاونٹین ہاوس کے کسی پروگرام میں شریک ہوں، اخوت اور فاونٹین ہاوس مل کر اس سلسلے میں جتنا بھی کام کر رہے ہیں وہ

لائقِ صد تحسین ہے۔ ہمارے بھائی جان توقیر احمد شریفی ایک ایسی سماجی شخصیت ہیں جو نیکی کے ان کاموں میں ہمیشہ سے پیش پیش دکھائی دیے، گزشتہ شب انہوں نے اخوت اور فاؤنڈیشن ہاؤس کے سالانہ ڈنر میں شرکت کی دعوت دی تو میں اور فرہاد ان کی پُرخلوص دعوت کو رد نہ کر سکے اور ہوٹل پرل کانٹینینٹل میں اس پروگرام میں شریک ہوئے وہاں توقیر بھائی، رفعت بھابھی کے علاوہ ہنستے مسکراتے بھائی دانش عزیز، محترم افضل پارس اور نوجوان شاعر سعادت علی سعدی سے مل کر دل شاد ہوگیا۔ اخوت اور فاؤنڈیشن ہاؤس کے ساتھ جتنے بھی لوگ بطور ڈونر جڑے ہیں ان سب کی محنت سے یہ پودا اب ایک ثمر بار درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے، ڈاکٹر محمد امجد ثاقب، ڈاکٹر عمران مرتضیٰ اور اُن کی ساری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے جنہوں نے دن رات محنت کر کے ذہنی امراض میں مبتلا افراد کے لئے راحت کا سامان پیدا کیا، بلاشبہ یہ ان کا بھی حق ہے کہ وہ ایک آسودہ زندگی گزاریں۔ توقیر بھائی کا خصوصی شکریہ جن کی بدولت احباب سے ملاقات بھی ہوئی اور اتنی عمدہ تقریب میں شرکت بھی ہوگئی۔

رپورٹ: وسیم عباس

☆☆☆

''روشنی ایک حادثہ ہے'' کی تقریب پذیرائی

دھرتی رنگ رائٹرز کلب نے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد میں واحد سراج صاحب کے حوالے سے جس تقریب کا اہتمام کیا وہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور تاریخی تقریب تھی۔ جس میں بڑی تعداد میں خواتین وحضرات نے شرکت فرمائی۔ "روشنی ایک حادثہ ہے'' پر اعلیٰ پائے کے مقالات اور گفتگو ہوئی۔ اسلام آباد کے دوستوں کا کہنا تھا کہ ایسی بھرپور تقریبات اکادمی میں کم کم ہوتی ہیں۔ احباب نے جس محبت اور خلوص کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کی وہ بھی قابل تعریف ہے۔ اکثر احباب دوسرے شہروں سے تشریف لائے تھے اور تقریب کے اختتام تک بیٹھے رہے۔ کچھ دوستوں نے واحد سراج صاحب کو روایتی چادر اور ہاروں کے تحائف بھی پیش کیئے۔ میزبان فرحین خالد، صفیہ شاہد اور فاطمہ عثمان نے سٹیج کو سجانے اور مہمانوں کے لیے خوب صورت اور معیاری شیلڈز کا اہتمام بھی کیا۔ فرحین خالد اور ان کی پوری ٹیم نے اس تقریب کی تیاری گزشتہ کئی ہفتوں سے شروع کر رکھی تھی جس کی وجہ سے اس تقریب کا ایک ایک لمحہ یادگار بن گیا۔

تاثرات: عامر سہیل

☆☆☆

یہ نئی بات تو نہیں کوئی

(نظم معرّیٰ)

پہلا یہ واقعہ کوئی تھوڑی
واقعے ایسے روز ہوتے ہیں
یہ نئی بات تو نہیں کوئی ہیں
روندنا کام ہے وڈیروں کا
روندتے آ رہے ہیں کب سے یہ
بے گناہوں کو خاندانوں کو
آج گر اک رئیس زادے نے
دُھت نشے میں جوانی کے ہو کر
روند ڈالا ہے کچھ غریبوں کو
یہ نئی بات تو نہیں کوئی
صلح ہو جائے گی یقیناً " کل
دیکھنا کل معاف کر دیں گے
قتل بے چارے ان وڈیروں کو
دنیا بھر کو دکھائے جائیں گے
میڈیا پر بھی لائے جائیں گے
کل کہانی کوئی نئی ہوگی

عاصم بخاری/میانوالی

عامر بن علی/ جاپان

نفرتیں تو بڑھ گئی ہیں دوستی ملتی نہیں
اس نگر میں اب سنا ہے عاشقی ملتی نہیں
میں نے دنیا بھر کی ہر اک کامیابی دیکھ لی
تجھ سے مل کر جو ملی تھی وہ خوشی ملتی نہیں
چھان کر صحرا جو دیکھا تب کہیں مجھ پر کھلا
ریت میں کھوئی کوئی شے قیمتی ملتی نہیں
اس کے چہرے کی دمک سے شہر میں تھی روشنی
اس قدر جو مہرباں ہو چاندنی ملتی نہیں
اور بھی دنیا میں کتنے خوبصورت لوگ ہیں
ہاں مگر جو اس میں ہے جادوگری ملتی نہیں
زرد پتے گر رہے ہیں جو خزاں کے خوف سے
پیڑ سے جو کٹ گرے تو زندگی ملتی نہیں
اس کی آنکھوں نے کہی جو بات مجھ کو یاد ہے
کاغذوں پہ جان ایسی شاعری ملتی نہیں

لبنیٰ صفدر/ لاہور

اس کی آنکھوں سے عیاں ہونا ہے
پھر محبت کا بیاں ہونا ہے
نیند تھوڑی سی عطا ہو مجھ کو
میرے خوابوں کو جواں ہونا ہے
خود کو رکھنا ہے پسِ منظر میں
اک حقیقت نے گماں ہونا ہے
عمر گزرے گی تری آنکھوں میں
اب ٹھکانہ بھی کہاں ہونا ہے
شور کرنا ہے گھنے جنگل میں
اب ہواؤں کی زباں ہونا ہے
پہلے دریا میں اُترنا ہے مجھے
پھر سمندر میں رواں ہونا ہے

✦✦✦

CamScanner

جس معاشرے میں انصاف نہ ہو وہاں رہنا کسی جہاد سے کم نہیں

جو شاعری قاری اور سامع کے جذبات کو چھو نہ سکے، زندہ نہیں رہتی

امریکہ میں مقیم ممتاز شاعر

احمد ندیم رفیع

سے حسن بانی کا خصوصی انٹرویو

میرے نزدیک باھمی محبت اور انسان دوستی کا پرچار سب سے بڑا نظریہ ھے

سوال: شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا۔ پہلے پہل کن شاعروں ادیبوں سے ملاقاتی ہوئی۔ پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟

جواب: شاعری کی طرف فطری میلان بھی تھا اور گھر کے ماحول نے بھی اس ذوق کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ میرے والد صاحب ملک رفیع الدین اور اردو زبان کے پروفیسر تھے۔ گھر میں اردو شعر و ادب کی کتابوں کی فراوانی تھی۔ سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں عامر فراز کے ساتھ مل کر شاعری کیا کرتا تھا۔ عامر فراز بعد میں حلقۂ اربابِ ذوق میں بہت فعال رہا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں مشکور حسین یاد اردو کے استاد تھے جن سے سیکھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں پروفیسر جعفر بلوچ سے بھی اپنی غزلوں کی اصلاح لی جو گورنمنٹ کالج ہی میں تعینات تھے۔ اسی کالج میں حامد یزدانی سے دوستی نے میرے ذوقِ شاعری کو مزید جلا بخشی۔ ایف ایس سی میں ایک طرحی مشاعرہ میں شرکت کی تو اس میں پہلا انعام ملا۔ صدرِ مشاعرہ سجاد باقر رضوی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر بہت شاباش دی اور خاص طور پر کہا کہ محنت کرتا رہا تو ایک دن اچھا شاعر بن پاؤں گا۔ ایف ایس سی کے بعد فارغ تھا تو ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کرلیا جس کے طفیل علمِ عروض سے آگاہی ہوئی۔ انہی دنوں غضنفر علی ندیم سے ملاقات ہوئی اور جب تک پاکستان میں رہا، باقاعدگی سے حلقۂ تصنیفِ ادب کی ہفتہ وار محفلوں میں شرکت کرتا رہا۔ ان محفلوں میں بہت سے لوگوں سے ملا اور بہت کچھ سیکھا۔ مرحوم اظہر جاوید صاحب کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ماہنامہ تخلیق میں میری ایک غزل شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میری شاعری قابلِ اشاعت ہے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں محمد یونس بٹ میرا ہم ذوق اور ہم جماعت تھا جس نے بعد میں مزاح نگاری میں بہت نام کمایا۔ ۱۹۸۲ء میں مرحوم امجد اسلام امجد ایک مشاعرے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج تشریف لائے۔ ان کو اپنی شاعری سنائی تو انہوں نے کہا کہ وہ مجھے ایک خط لکھ کچھ مشورے دیں گے۔ اور واقعی ان کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اگر اچھا شاعر بننا ہے تو اساتذہ اور مشاہیر کی شاعری کا مطالعہ اپنی ایک عادت بنالوں۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

سید انوار احمد، احمد ندیم رفیع، حمیدہ شاہین، ڈاکٹر ضیاالحسن اور علی محمد۔ محفل مشاعرہ (امریکہ)

احمد ندیم قاسمی اور عامر فراز کے ساتھ

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں کے زیر اہتمام عالمی سیمینار

جاپان میں اردو زبان و ادب کا فروغ اور عصری صورت حال

پرنسپل آرگنائزر ڈاکٹر رابعہ سرفراز | صدارت ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس | مہمان خصوصی عامر بن علی | نظامت ڈاکٹر ماجد مشتاق

تقریب میں اساتذہ اور طلباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی

شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے زیر اہتمام 19 دسمبر 2025 بروز جمعہ 2 بجے دوپہر "جاپان میں اردو زبان و ادب کا فروغ اور عصری صورت حال" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ سیمینار کے مہمان خصوصی عامر بن علی تھے۔ صدارت پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ نے کی۔ سیمینار کی پرنسپل ارگنائزر پروفیسر ڈاکٹر رابعہ سرفراز صدر شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں تھیں۔ مہمان خصوصی عامر بن علی نے جاپان میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی اور حاضرین محفل کے سوالات کے جوابات دیئے۔ انہوں نے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی فرمائش پر اپنا کلام بھی سنایا۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ماجد مشتاق نے انجام دیئے۔ پروفیسر ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے عامر بن علی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے خصوصی طور پر وقت نکال کر شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں میں تشریف لائے اور طلبہ طالبات کو جاپان میں اردو زبان کی صورتحال کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کیں۔ عامر بن علی نے کہا کہ کوئی بھی زبان اس وقت ترقی کرتی ہے جب اس کے ملک کی معیشت ترقی کرتی ہے۔ اگر ہم اردو زبان کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی معیشت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہوگا۔ پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس نے جاپانی ادب کے اردو تراجم کے حوالے سے تحقیق پر زور دیا۔ یہ ایک شاندار سیمینار تھا جس میں طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سیمینار کے اختتام پر عامر بن علی صاحب کی خدمت میں شیلڈ اور سرٹیفکیٹ پیش کیے گئے۔

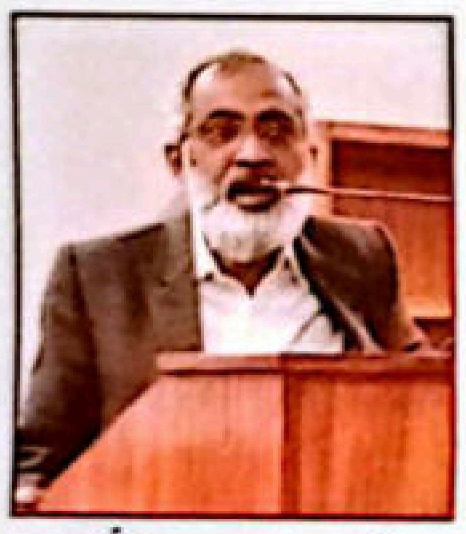

ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس

عامر بن علی

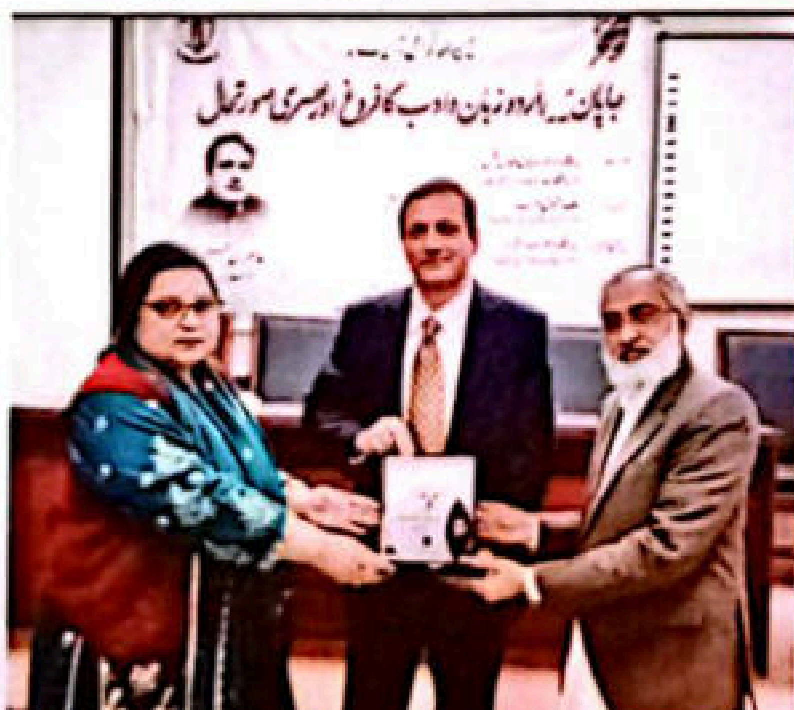

تقریب کی میزبان اور صدر نے مہمان خصوصی عامر بن علی کو شیلڈ اور تعریفی سند پیش کی

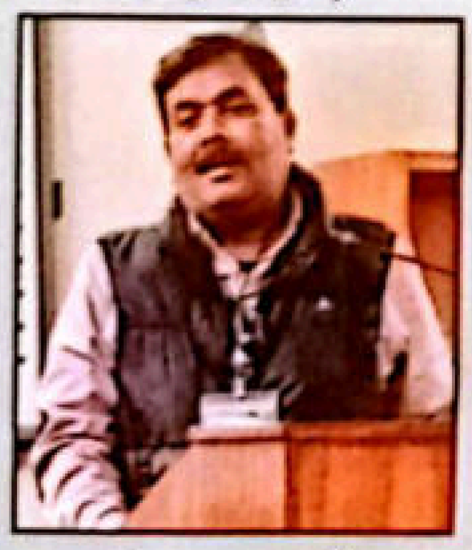

ڈاکٹر ماجد مشتاق

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور

0300-4489310 - 0331-4489310

nastalique786@gmail.com

Read Arxang online

www.amirbinali.com

www.millat.com